نومبر ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد۲۱، شمارہ۱۱، نومبر ۲۰۱۷ء/صفر ۱۴۳۹ھ

مشمولات

O تعلیم و تربیت
- تدریس القرآن کا جدت آمیز منصوبہ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۴
- مادہ پرستانہ تعلیم کے تباہ کن اثرات — حافظ محمد موسیٰ بھٹو — ۷
- اسلامی تحقیق کے اصول (۳) — ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ — ۹
- جدید نصاب، دینی تقاضے اور مشترکہ نصابی خاکہ — ڈاکٹر محمد نعمان — ۱۷

O انتخابی جدوجہد اور غلبۂ دین
- سید مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی فکر — ڈاکٹر محمد امین — ۲۳
- انتخابی جدوجہد سے غلبۂ دین ممکن نہیں — پروفیسر طارق بٹ — ۴۰
- موجودہ انتخابی ڈھانچہ غیر اسلامی ہے — چوہدری رحمت علی — ۴۵
- جماعت اسلامی کی خدمت میں ایک مخلصانہ تجویز — مدیر — ۵۱

O اسلام اور پاکستان
- اسلامی انقلاب کیسے آ سکتا ہے؟ — مفتی ابولبابہ شاہ منصور — ۵۳
- پڑھتا جا شرماتا جا — ’نقیب سحر‘ — ۵۶

تعلیم و تربیت　　پروفیسر ملک محمد حسین

سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قرآن حکیم کی ناظرہ، تجوید، تحفیظ اور خصوصاً ترجمۂ قرآن کی مہم

تدریس القرآن کا جدت آمیز منصوبہ

تعلیمی اداروں اور اصحابِ خیر کا تعاون ہی اس منصوبے کو کامیاب بنا سکتا ہے

قرارداد مقاصد اور آئین کا آرٹیکل ۳۱ تقاضا کرتا ہے کہ حکومت عوام کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں جس طرح کہ قرآن و سنت میں بتایا گیا ہے۔ آئین کے آرٹیکل ۳۱ میں ہی یہ بات صراحت سے بیان کی گئی ہے کہ عوام کو قرآن مجید اور عربی کی تعلیم دی جائے گی تا کہ وہ اسلام کا فہم حاسل کر کے اپنی زندگی قراان و سنت کی تعلیمات کے مطابق گزار سکیں۔

پاکستان کا حصول اسلام کے نام پر ہوا اور شروع ہی سے اس بات کا شعور وطنِ عزیز میں موجود تھا کہ قرآن حکیم کی تعلیم سب کے لئے لازمی ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں پہلی دفعہ حکومتی سطح پر صدر محمد ایوب خان کی حکومت کے دوران ۱۹۶۰ء میں سکولوں میں ناظرہ قرآن لازمی قرار دیا گیا۔ اس حکم کے مطابق پانچویں جماعت تک ناظرہ قرآن کی تکمیل لازمی تھی۔ حکومت نے گرمیوں کی تعطیلات میں دو سال تک دو، دو ماہ کے قرات و تجوید کے دورانِ ملازمت کورسز تمام پرائمری اساتذہ کو کروائے تا کہ وہ سکول طلبہ کو ناظرہ قرآن کی صحیح تدریس کر سکیں۔ یہ بھی لازم قرار دیا گیا کہ ٹیچر ٹریننگ کے کورسز میں داخلہ لینے والے تمام امیدواروں کے لے لازم ہو گا کہ وہ ناظرہ قرآن کی تکمیل کر چکے ہوں نیز سکولوں میں قرآن کی تدریس کے لیے ہر روز کے ٹائم ٹیبل میں زیرو پیریڈ مختص کیا گیا جو نظامِ اوقات میں پہلا پیریڈ ہوتا تھا۔

جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں ہر ہائی اور مڈل سکول میں قاری کی اسامی پیدا کی گئی تا کہ قرآن کی تدریس کو زیادہ مئوثر بنایا جا سکے۔ بے نظیر مرحومہ کے دوسرے دورِ حکومت میں ڈائریکٹو نمبر ۳ کے ذریعے حکم جاری کیا گیا کہ ٹیچر ایجوکیشن کے تمام اداروں میں تمام طلبہ کے لیے ترجمۂ قرآن لازمی ہو گا تا کہ مستقبل میں سکولوں میں طلبہ کے لیے ترجمۂ قرآن لازمی قرار دیا جائے۔

نواز شریف کی بطورِ وزیر اعظم دوسری حکومت میں ایک انتظامی حکم کے ذریعے تمام سکولوں میں چھٹی سے بارہویں جماعت تک ترجمۂ قرآن کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی لیکن اکتوبر ۱۹۹۹ء میں نواز شریف کی حکومت ختم ہونے کے بعد یہ منصوبہ بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ اب جب کہ

وزیر اعظم تیسری بار برسرِ اقتدار آئے تو مسلم لیگ ن کی حکومت نے چھٹی سے بارہویں جماعت تک پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے ترجمۂ قرآن لازمی قرار دیا ہے جس پر شاید عمل درآمد بھی شروع ہو گیا ہوگا۔

۱۹۶۰ء سے اب تک قرآن حکیم کی تدریس کی جتنی حکومتی کوششیں ہوئیں وہ سب ناکام ہوئیں۔ اس ناکامی میں زیادہ بڑا حصہ تو اساتذہ کرام اور تعلیمی انتظامیہ کا ہے لیکن دینی مدارس اور دینی سیاسی جماعتیں بھی بری الذمہ نہیں ہیں۔ اس کی تفصیل پھر کبھی۔ فی الحال صرف ایک جملہ معترضہ ہی کافی ہے۔

[illegible] [المائدۃ ۵:۲] کے حکم کے تحت کم از کم دینی سیاسی جماعتوں اور دیگر دینی حلقوں کو اس کی نہ صرف تحسین کرنا چاہیے تھی بلکہ آگے بڑھ کر تعاون دینا چاہیے تھا تاکہ ماضی کی طرح یہ کوشش بھی ناکام نہ ہو جائے۔ قرآن فہمی اور ترجمۂ قرآن کی تدریس پوری قوم کا فریضہ ہے۔ ہاں حکومت کا کام آسانیاں مہیا کرنا ہے۔ حکومت اپنی تمام تر نیک خواہشات کے باوجود یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ اس طرح کا منصوبہ قومی سطح پر مؤثر طریقے سے نافذ کر سکے۔

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ نے فیصلہ کیا کہ ہم کم از کم علمی سطح پر حکومت کا ساتھ دیں گے اور جہاں تک ممکن ہوا تدریس القرآن کے حوالے سے تیار کیا گیا مواد ان مدارس کو مفت مہیا کرنے کی بھی کوشش کریں گے جو اس سلسلہ میں مالی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس مقصد کے لیے تدریس القراں فاؤنڈیشن ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے جس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد امین، سیکرٹری جنرل جناب یحییٰ رشید ایڈووکیٹ اور خازن جناب الیاس گھمن صاحب ہیں۔ پہلے سیپارے اور اُس کی ٹیچر گائیڈ تیار ہو چکی ہے اور بعض اداروں میں اس مواد کے مطابق ترجمۂ قرآن کی کلاسز شروع ہو چکی ہیں۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذلک۔

طریقۂ کار یہ ہے کہ جو سکول یا سکول سسٹم یا کالج یا یونیورسٹی اپنے ہاں ترجمۂ قرآن کی کلاس شروع کرنا چاہے وہ ٹرسٹ کے ذمہ داران سے رابطہ کرے۔ ذمہ داران اُن کا رابطہ پبلشر سے کرا دے گا جہاں یہ مواد ’نہ نفع ۔ نہ نقصان‘ (No Profit-No Loss) کی بنیاد پر طبع کرنے کی سہولت موجود ہے۔ وہاں براہِ راست آرڈر دیں اور تدریسی مواد حاصل کریں۔ اگر کوئی ادارہ یا

ادارے اپنے کسی پبلشر سے طبع کرانا چاہیں تو ٹرسٹ سے سافٹ کاپی لیں اور خود اپنے انتظام میں طبع کرالیں۔ اگر کوئی ادارہ یا ادارے مالی طور پر استطاعت نہ رکھتے ہوں تو عدمِ استطاعت کے ثبوت کے ساتھ تدریس القرآن فاؤنڈیشن ٹرسٹ سے رابطہ کریں تو انہیں تدریسی مواد مفت مہیا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ٹرسٹ اس سلسلہ میں مخیر حضرات وخواتین سے مالی معاونت کی اپیل کرتا ہے۔

قرآن کا پڑھنا، پڑھانا کارِ خیر ہے۔ خصوصاً نئی نسل کو ترجمہ قرآن سے روشناس کرانے کا بہت بڑا اجر ہے۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ مخیر حضرات کو شامل ہونا چاہیے۔ تعلیمی اداروں میں ترجمۂ قرآن کی کلاسز شروع کرنے کے لیے اساتذہ کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ تربیت ٹرسٹ کے ذمہ داران فری مہیا کریں گے۔ اس تربیت کا دورانیہ آٹھ گھنٹے ہے جو ایک یا دو دنوں میں سہولت کے مطابق دی جاسکتی ہے۔

اس وقت رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی کے رائے ونڈ لاہور کیمپس میں ترجمۂ قرآن کی کلاسز کا اجراء ہو چکا ہے۔ بعض دارِارقم سکولز اور دی ایجوکیٹر سکولوں میں بھی اجراء ہو چکا ہے۔ بعض انفرادی سکول بھی اس قافلے میں شامل ہو چکے ہیں۔ حرا سکولوں میں ان شاء اللہ جلد اجراء ہو جائے گا نیز کیڈٹ کالج کوہاٹ۔ سوات، مانسہرہ اور چترال کے بعض سکولوں اور کالجوں میں تدریس القرآن کی کلاسز کے اجراء کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ضلع قصور کے بعض سرکاری سکولز نے بھی رابطہ کیا ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ اس دفعہ حکومت نے جس نیک کام کے لیے قانون سازی کر کے کوشش شروع کی ہے وہ ناکام نہ ہو اور پوری قوم ترجمۂ قرآن سے واقف ہو جائے۔ ہم خلوصِ دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ دہشت گردی، انتہا پسندی اور فرقہ واریت کا ایک ہی علاج ہے کہ مسلمان قرآن کو سمجھیں اور خود براہِ راست سمجھیں۔ قرآن کا فہم حاصل ہوگا تو معاشرے میں تبدیلی آئے گی۔

ہم یہ بھی سفارش کرتے ہیں کہ ترجمہ قرآن کا ہمارا مواد نہ صرف سکولوں میں استعمال کیا جائے بلکہ مساجد میں اور گلی محلوں میں بھی مخیر حضرات ترجمۂ قرآن کی کلاسز جاری کریں تا کہ قرآن کی سمجھ پر مبنی معاشرے میں جلد از جلد تبدیلی آئے اور یہ وطن امن کا گہوارہ بن جائے۔

رابطہ کے لیے: ڈاکٹر محمد امین: 0300-4354673

یحییٰ رشید ایڈووکیٹ: 0333-4287640۔ پروفیسر ملک محمد حسین: 0333-4404260

تعلیم و تربیت

حافظ محمد موسیٰ بھٹو[۱]

مادہ پرستانہ تعلیم کے تباہ کن اثرات

بندۂ مومن کے لیے سب سے بڑی تشویشناک بات، جو اس کی نیند اُڑانے کے لیے کافی ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری ملت کے ذہین، باصلاحیت اور خوشحال خاندانوں کے افراد کو جو تعلیم دی جارہی ہے، وہ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت بلکہ اس سے مسحور ہونے کی تعلیم ہے۔ جب کہ انہیں اپنی پاکیزہ تہذیب، اپنی ملی تاریخ، اپنے دینی، روحانی اور نفسیاتی و عمرانی علوم سے بالکل بے بہرہ رکھا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا المیہ یہ ہے کہ مغرب کے ہاں بچوں کو قوموں کے عروج وزوال اور اپنی قوم کی بقا کے جو اصول دورانِ تعلیم ابتدا ہی میں ذہن نشین کرائے جاتے ہیں، جو بتدریج ان کے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں، ان سے ان کے قومی کردار کی تشکیل ہوتی ہے، تنظیم سازی کی صلاحیت اُبھرتی ہے اور ہر کام ظاہری طور پر سلیقہ سے سرانجام دینے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری نسلوں کو مغرب کے ان بنیادی، اخلاقی نوعیت کے مثبت اصولوں سے بھی محروم رکھا جاتا ہے، اپنی پاکیزہ تہذیب اور اس کے بنیادی اصولوں و تعلیمات سے محرومی تو ہے ہی، کم از کم انہیں قوموں کے عروج وزوال کے حوالے سے انسانی تاریخ کے طویل تجربات و مشاہدات کے نقطۂ نظر سے مغرب ہی کے مثبت اصولوں سے آشنا کیا جاتا، اور اس اعتبار سے ان کی تربیت کی جاتی تو بھی ہمارا سیاسی نظام رشوت، بدنظمی، افراتفری، قوم و ملت کو نقصان پہنچا کر اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل، جھوٹ، ملاوٹ، کاروباری بددیانتی، سرکاری افسروں کی طرف سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں آخری حد تک نااہلی، سرکاری خزانہ کی لوٹ مار اور قوم کو پامال کرکے مالدار سے مالدار تر بننے کا جنون تو پیدا نہ ہوتا۔

افسوس اور دُکھ کی بات یہ ہے کہ ملک میں ہزاروں کی تعداد میں جو پرائیویٹ تعلیمی ادارے وجود میں آگئے ہیں، لگ بھگ ان سب کے سامنے ایک ہی مقصد پیش نظر ہے کہ طلبہ سے بھاری فیس کے ذریعہ کس طرح دولت کمائی جائے۔ بچوں کی بہتر سمت میں تربیت اور ان کی مثبت ذہن سازی اور ان پر اپنی تہذیب کے نقوش و خطوط مستحکم کرنا، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تو سرکاری تعلیمی اداروں کے پیش نظر ہے اور نہ ہی پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے سامنے ہے۔

اس سے ہمارے تعلیم ساز افراد کے ذہنی افلاسِ کا پتہ چلتا ہے۔ جو تعلیمی ادارے قوم کو

[۱] مربی، مصنف، دانشور، مدیر ماہنامہ بیداری، حیدرآباد

تہذیبی اور تربیتی اعتبار سے خالی ذہن، مغرب کی مادہ پرست فکر وتہذیب کے دلدادہ اور پیٹ اور جنس کے علاوہ پاکیزہ نصب العین سے عاری نسلیں فراہم کرتے ہوں، ان تعلیمی اداروں کے سربراہ اور پالیسی ساز افراد ملک وملت کے ساتھ اتنی بڑی بدخواہی کررہے ہیں کہ ان کی یہ حرکت ملت کی بنیادوں کو اکھاڑنے اور مثبت اصولوں کی حامل قوم کا غلام بنانے کے مترادف ہے۔ یہ ایسا ناقابل معافی جرم ہے، جس کی جتنی بھی سزا مل جائے وہ کم ہے۔ اس سلسلہ میں بندۂ مومن کی تشویش اور اضطراب اور آہ کے اگر کچھ اثرات واجزاء ہی تعلیمی اداروں کے سربراہوں تک پہنچ سکیں تو شاید ان کی بیداری کی کچھ نہ کچھ صورت پیدا ہوسکے۔ کسی بھی ملت کے افراد اپنی نسلوں کی تباہی کے فیصلے کرنے کے متحمل نہیں ہوتے لیکن بدقسمتی سے اس سلسلہ میں ہمارے ملک کے ذمہ داروں کی بے حسی، فکری افلاس، غیر ذمہ داری اور غیر سنجیدگی ساری سرحدوں کو عبور کرچکی ہے۔ ان حالات میں بندۂ مومن اللہ ہی سے فریاد کرتا ہے کہ وہ حکمرانوں، ریاست اور تعلیم کے ذمہ داروں کو عقل وفہم عطا فرمائے تا کہ وہ تعلیم کے ذریعہ معاشرہ کو بہتر افسر، بہتر حکمران، بہتر تاجر، بہتر استاد، بہتر دانشور اور اہل علم فراہم کرسکیں۔

فرمودۂ اقبالؒ

خودی کا سِرِّ نہاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

کِیا ہے تُو نے متاعِ غُرور کا سودا
فریبِ سُود وزیاں ، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

یہ مال ودولتِ دنیا، یہ رشتہ وپیوند
بُتانِ وہم وگماں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

تعلیم و تحقیق

ڈاکٹر محمد رفیع الدین [۱]

اسلامی تحقیق کے اصول (۳)

ایک حیاتیاتی ضرورت

میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ مہیا کرنا مسلمانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے جس کو وہ صرف اپنی زندگی کی قیمت ادا کرکے ہی نظرانداز کرسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ یا جارحانہ اقدام بہترین مدافعت ہوتا ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اس جنگ کی صورت میں درست ہے جو ایک ریاست کو فوجی محاذ پر لڑنی پڑتی ہے اسی طرح سے اس جنگ کی صورت میں بھی درست ہے جو اس کو نظریاتی محاذ پر لڑنی ہوتی ہے۔ اگر ہم بروقت اور اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے، اسلام کی مدافعت کے لیے کے لیے دوسرے نظریات کے خلاف علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہ کھول سکیں تو ممکن ہے کہ پھر اسلام کی مدافعت کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے اور ہم دیکھیں کہ جس نظریۂ حیات کی مدافعت کے لیے ہم آخر کار باہر نکل رہے ہیں وہ وہ نہیں جس کی مدافعت کے لیے ہمیں کل تک باہر نکلنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ لیکن جب تک ہم اس طریقے پر جس کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے، اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ پیدا نہ کریں، ہم اس دور میں علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہیں کھول سکتے۔ کام کی فوری ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ہمیں اپنے بہترین اور سب سے زیادہ زوردار دماغوں کو اس کام پر لگانا چاہیے تاکہ یہ جلد از جلد اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرے۔ ہمیں چاہیے کہ ہر پائی جو میسر آسکتی ہے اس کام پر لگا دیں اور جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ جب تک کام ختم نہ ہو جائے پوری تندہی کے ساتھ اسی کام میں مصروف رہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مستشرقی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق کے کاموں کو کلیتہً بند کردینا چاہیے۔ لیکن ہمیں یقیناً مستشرقی تحقیق کے کام کو خواہ ہم آئندہ اس کو کسی بھی نام کے ساتھ جاری رکھنا پسند کریں، یونیورسٹیوں تک محدود کردینا چاہیے تاکہ اسلامی تحقیق کے واعظ اور فریب کارانہ لقب کے ساتھ جو درحقیقت حیلہ ساز عیسائیت نواز مستشرقی ذہنوں کی پیداوار ہے، وہ ہمارے

---

[۱] نامور فلسفی، مصنف، دانشور اور بانی صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانگرس، لاہور

اسلامی تحقیق کے اداروں میں داخل انداز نہ ہو سکے۔

میکانکی اسلامی تحقیق کا کام

باقی رہا میکانکی اسلامی تحقیق کا کام، اسے کلیتہً اصلی اسلامی تحقیق کے کام کی ضرورتوں کے ماتحت رہنا چاہیے اور فقط ان فضلاء اور حکماء کی درخواست پر ہی انجام دینا چاہیے جو اصلی اسلامی تحقیق کے کام میں لگے ہوئے ہوں تا کہ ان کی ضروریات کو جو ان کے کام کے دوران میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہیں، پورا کر سکے۔ البتہ ہم کو میکانکی اسلامی تحقیق کے کام کی طرف اس وقت بھی رجوع کرنا پڑے گا جب ہم اپنی مقدس کتابوں یعنی قرآن اور حدیث کا یا ان کتابوں کا جو ان مقدس کتابوں کی حکمیاتی یا سائنسی توجیہہ پر مشتمل ہوں گی، اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لیے دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے لگیں گے۔ لیکن یہ بات ہماری انتہائی کوتاہ نظری اور ذوقِ صحیح سے تہی دستی کا ثبوت ہوگی کہ ہم ایسے موقعہ پر بلاضرورت میکانکی اسلامی تحقیق پر اپنا سارا وقت صَرف کرتے رہیں جب کہ مقدس کتابوں پر خود ہمارا اپنا یقین ہی ختم ہو رہا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کے آخری بحرانی لمحوں میں کشتی کو بچانے کی بجائے کشتی پر آنے والی تباہی سے بے پروا ہو کر اس کے مسافروں کی صحیح تعداد اور ان کے کپڑوں کی رنگت اور ساخت کی جزئیات اور تفصیلات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے بڑی کاوش کرتا رہے یہاں تک کہ کشتی ڈوب جائے۔ قرآن حکیم کا ایک نہایت ہی عمدہ اشاریہ یا میکانکی اسلامی تحقیق کا کوئی ایسا ہی اور نتیجہ اس مسلمان کے لیے کسی کام کا نہیں جو اسلام پر اپنا یقین کھو چکا ہو۔ اگرچہ اسے وجود میں لانے کے لیے سال ہا سال کی محنتِ شاقہ بروئے کار لائی گئی ہو۔

مسلمانوں کی فوری ضرورت

بعض وقت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فوری اور شدید ضرورت یہ ہے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کو ٹھیک طرح سے اور پوری طرح سے نہ سمجھ لیں ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں؟ اس وقت ٹھیٹھ اسلام ہی کی مختلف توجیہات کی جارہی ہیں لہٰذا ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس سے ہم نے ایک نیا قانونی نظام اخذ کرنا ہے؟ جب اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ جو صرف ایک ہی

ہوسکتی ہے، وجود میں آجائے گی تو پھر وہ نہ صرف غیر مسلموں کے غلط نظریات اور فلسفوں کی مکمل اور ایمان پرور تردید کرے گی بلکہ اسلام کی ان غلط اور بے بنیاد توجیہات کا بھی مکمل اور یقین افروز ابطال کرے گی جو ان مسلمانوں نے پیش کی ہیں جو اسلام کے جدیدیت زدہ کوتاہ اندیش مسلمان نکتہ چینیوں کو مطمئن کرنے کے لیے اسلام کو ایک نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا فقط اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ ہی وہ بنیاد ہے جس پر ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ جب اسلام کی ایسی توجیہہ فی الواقع وجود میں آئے گی تو ہم دیکھیں گے کہ احکام اسلامی کی علتوں اور حکمتوں کے کھل جانے کی وجہ سے اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کے بہت سے مشکل مسائل خود بخود حل ہو گئے ہیں اور اس کا سارا کام نہایت آسان ہو گیا ہے۔

بے وقت کی کوشش

مسلمانوں کی زندگی کے اس مرحلہ پر جب اسلام پر ان کا یقین کمزور ہو رہا ہے، اسلام کے قانونی نظام کی تشکیل جدید ایک بے وقت کی کوشش اور ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے موجودہ قوانین بہتر نہیں بلکہ بدتر ہو جائیں گے۔ مجتہد کو جو چیز صحیح اجتہاد کے راستہ پر رہنمائی کرتی ہے وہ علوم قدیمہ وجدیدہ کا علم ہی نہیں بلکہ خدا کی محبت اور معرفت کا نور بھی ہے۔ انحطاطِ دین کے اس زمانہ میں یہ نور نایاب نہیں تو صعب الحصول ضرور ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ نور پوری طرح سے روشن ہو، نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ عرصہ دراز تک قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعہ میں لگا رہے اور صحابہ اور ائمہ اور صلحا کی پاکیزہ اور مجاہدانہ زندگیوں سے اثر پذیر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح سے اسلام کے اخلاقی اور مذہبی نظم وضبط کے ماتحت رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے لیکن جب تک ہم اسلام کے اخلاقی اور مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اس وقت تک ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کی بھی کوئی عزت نہیں کر سکتے اور اس وقت تک ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی قوانین کو کس طرح بدلنا چاہیے اور آیا ان کو بدلنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ ایسی حالت میں ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کو کم از کم اسلام کے ان اخلاقی اور مذہبی قوانین کی روشنی میں نہیں بدل سکتے جن کی خلاف ورزی ہم دن رات کرتے رہتے ہیں۔

سچا اجتہاد

سچا اجتہاد ہمیشہ اسلام کی گہری محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ایک قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہؓ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔ اجتہاد کے لیے ہماری موجودہ خواہش اسلام کی محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام کی پوشیدہ نفرت اور غیر اسلامی نظریات کی چھپی ہوئی محبت اور ستائش کا نتیجہ ہے۔ اس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ ہمارے ان خیالات اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو ہم نے غیر اسلامی نظریات سے مستعار لیے ہیں اور جن کو ہم دل ہی دل میں چاہتے اور بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں۔ یہ خواہش دراصل اس بات کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کو اس ''حکمت'' اور ''دانائی'' سے بہرہ ور کیا جائے جو ہم نے دوسرے نظریات سے سیکھی ہے اور اس طرح سے اسلام کو ایک نئے ''حسن و جمال سے اور ایک نئی شان و شوکت'' سے جس کا نظارہ ہم ان نظریات کی قیادت میں کر چکے ہیں ''مزین'' کیا جائے۔ یہ سچا اجتہاد نہیں کیونکہ یہ وہ اجتہاد نہیں جو شریعت کی قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے بلکہ یہ شریعت کی تحریف ہے جو ہم اپنے توہمات کے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں۔ یا یہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے ہم دوسرے نظریات کو، جنہیں ہم پسند کرتے ہیں، جہاں تک ہمارا بس چلتا ہے، اسلام کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ سچا اجتہاد اس وقت ممکن ہوگا جب ہم اسلام سے پھر ایسی ہی محبت کا احساس کرنے لگیں گے جیسی کہ پہلے ہمارے دلوں میں تھی اور ہم اس شریعت کو جس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہؓ کا عمل تھا پھر ایسی ہی محبت کی روشنی میں پوری طرح سے سمجھنے لگیں گے۔ جب تک ہمیں اسلام کی محبت کا یہ مقام پھر حاصل نہیں ہو جاتا ہم اسلام کی اس بصیرت سے محروم رہیں گے جس کی مدد سے ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے یا نہیں کہ ہم شریعت کی روشنی میں اس کی اصلاح کے لیے نئے قوانین وضع کریں اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بصیرت حاصل تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ عام بے یقینی کے اس دور میں یہ بصیرت ہمیں بھی حاصل ہے!

ہمارے معاشرہ کے موجودہ حالات کس چیز کے مقتضی ہیں؟

جس چیز کو ہم معاشرہ کا ایک ناگزیر ارتقائی تغیر سمجھ رہے ہیں وہ ہمارے خیال میں اجتہاد اور

نئے قوانین کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ درحقیقت مغرب کی تقلید میں ہماری عام اخلاقی گراوٹ، غیر اسلامی نظریات سے ہماری محبت اور اسلام کے اخلاقی اور دینی ضبط اور نظم سے ہماری نفرت اور بغاوت کے عوامل ہیں جو ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل کر رہے ہیں۔ یہ تمام حالات اسلام پر ہمارے یقین کے انحطاط کی علامات کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ موجودہ صورت میں ہمارا اجتہاد باطل ہوگا اور ان افسوسناک حالات کو بہتر نہیں بلکہ بدتر بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اجتہاد شریعت کے وقار کو اور اس کے ساتھ پورے اسلام کے وقار کو اور کم کرے گا جس سے ہمارا یقین اور مضمحل ہو جائے گا اور ہم میں سے بعض لوگ، جن کا ایمان پہلے ہی کمزور ہے، ناحق اور ناروا طور پر یہ سمجھنے لگیں گے کہ اسلام ایک وقتی نظریۂ حیات تھا جو حالات کے ساتھ بدل گیا ہے۔ لیکن اسلام کی ساری تاریخ بتا رہی ہے کہ ایسے اجتہاد کو سچے مسلمانوں نے کبھی قبول نہیں کیا اور اس کے باوجود سچا اسلام ہمیشہ زندہ اور باقی رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے کہا ہے کہ یقین و ایمان کے انحطاط کے اس دور میں متقدمین کے قدم پر چلنا اس سے بدرجہا بہتر اور محفوظ تر ہے کہ ایسے لوگوں کا اجتہاد قبول کیا جائے جو نور ایمان سے محروم ہو چکے ہوں۔ ان حالات کا صحیح علاج یہ نہیں کہ ہم نئے قوانین وضع کریں جو ہمارے اعمال و افعال کو زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور سطحی طور پر بدل سکتے ہیں بلکہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ ہم اسلام کے جدید نظام تعلیم کو نافذ کریں جس میں خدا کا تصور تمام طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی یا انسانی اور اجتماعی علوم کو منظم کرنے والا محوری اور مرکزی تصور ہو۔ صرف ایسا نظام تعلیم ہی فرد کو ذہنی طور پر پوری طرح سے بدل کر درست کر سکتا ہے۔ یہ نہ تو کوئی دیانتداری ہے اور نہ انصاف کہ ہم پہلے خود ہی ایک ایسا تعلیمی اور ثقافتی ماحول پیدا کریں جس میں فرد کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت صرف اس طرح سے ہو سکے کہ وہ اسلام کے نقطہ نظر سے سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہے اور پھر یہ شکایت کریں کہ اس کے اعمال و افکار درست نہیں اور ایسے قوانین وضع کریں جو اس کے نادرست اعمال میں ایک بیرونی مصنوعی دباؤ کی صورت میں رکاوٹ پیدا کریں۔ قوانین صرف وہاں کام کرنے کے لیے وضع کیے جاتے ہیں جہاں تعلیم ناکام رہ گئی ہو۔ ہمارے لئے اس بات کا کوئی جواز موجود نہیں کہ ہم تعلیم کی اصلی دلوں کو بدلنے والی قوت کو آزمائے بغیر قوانین کی مصنوعی قوت سے کام لیں جو ہمارے ظاہری اعمال کو بھی بدل نہیں سکتی۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہم معاشرہ کو جدید اسلامی نظام تعلیم کے ذریعہ سے حقیقی معنوں میں اور بنیادی طور پر بدلنے

کی بجائے اسے مصنوعی اور سطحی طور پر بدلنے کے لیے موجودہ اسلامی قوانین کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب قوانین پر عمل کرنے کی نیت موجود نہ ہو تو ان کی زد سے بچ کر نہایت آسانی کے ساتھ ان کی خلاف ورزیاں کی جا سکتی ہیں۔

لیکن جدید اسلامی نظام تعلیم جو نہ صرف اسلامی ہونا چاہیے بلکہ علمی اور عقلی لحاظ سے بھی محکم اور غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے، اس بات پر موقوف ہے کہ آیا ہم تعلیم کا کوئی معقول اور صحیح فلسفہ جو لازماً اسلامی فلسفہ ہوگا، پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں اور تعلیم کا ایسا فلسفہ انسان اور کائنات کی صحیح علمی اور عقلی توجیہہ، دوسرے لفظوں میں اسلام کی سائنسی اور حِکمیاتی توجیہہ کے ایک جزو کے طور پر ہی وجود میں آ سکتا ہے، ورنہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کی یہی سائنسی اور حِکمیاتی توجیہہ ہے جو اسلامی نظام قوانین کی ایک ہی ممکن بنیاد بھی ہے۔ غرض ہم جس نقطہ نظر سے بھی دیکھیں ہماری فوری ضرورت یہ نہیں کہ ہم اسلام کے قوانین کو بدل دیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اصلی اور صحیح قسم کی اسلامی تحقیق کے ذریعہ سے اسلام کی حِکمیاتی اور سائنسی توجیہہ پیدا کر کے اسلام پر اپنے ایمان کو تازہ کریں اور اسلام کی صحیح علمی اور عقلی واقفیت سے اپنے آپ کو مسلح کریں تا کہ محض عالم انسانی کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے ہم جس نظریاتی جنگ میں مجبوراً شریک ہیں، اس میں فتح پائیں اور شکست کھا کر مٹنے سے محفوظ رہیں۔

میکانکی تحقیق کی ایک نئی قسم

جو لوگ اسلام کی محبت سے بے نصیب ہو کر دل ہی دل میں غیر اسلامی نظریات کی طرف مائل ہو چکے ہیں، ان کی اس خواہش نے کہ اسلامی قوانین کو بدل دینا چاہیے، پاکستان میں ایک نئی قسم کی میکانکی تحقیق کو جنم دیا ہے جسے بہت سے مسلمان غلطی سے اسلامی تحقیق سمجھتے ہیں۔ پہلے اس بات کی خواہش کرنا کہ اسلامی قوانین کو غیر اسلامی نظریات کی سمت میں بدل دیا جائے اور پھر اس خواہش کی تکمیل کے لیے موافق حالات پیدا کرنے کی غرض سے ایسی صحافتی قسم کی کتابیں تیار کرنا جن میں ہمارے علماء متقدین و متاخرین کے موجودہ علمی ذخیروں کو بلکہ قرآن ور حدیث کے ترجموں کو بھی ایک نئی ترتیب، نئی زبان اور نئے مفہوم کا جامہ پہنایا گیا ہو جو اس خواہش سے مطابقت رکھتا ہو، ایک ایسا عمل ہے جسے ہم ایک خاص مقصد سے انجام دی ہوئی میکانکی قسم کی

کتاب سازی تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسلامی تحقیق کا نام نہیں دے سکتے۔اس کا مقصد یہ نہیں کہ اصلی اور حقیقی اسلام کی علمی، عقلی اور حکمیاتی بنیادوں کو دریافت کیا جائے اور واضح کیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ اس اسلام کو بدل دیا جائے اور جس حد تک بھی ممکن ہو اسے غیر اسلامی نظریات اور ان کے تصورات کے قریب تر لایا جائے تاکہ ان نظریات کے چاہنے والوں کو اسلام سے مطمئن کیا جا سکے لیکن اس قسم کی میکانکی تحقیق کا شوق رکھنے والے اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ جن نظریات سے توافق کی وہ آرزو رکھتے ہیں وہ خود ناپائیدار ہیں اور اپنا کوئی مستقبل نہیں رکھتے اور صرف ایک ہی نظریۂ حیات یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ تاقیامت زندہ اور قائم رہے اور یہ وہی اسلام ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم میں چھوڑا تھا اور جس پر صحابہؓ نے عمل کیا تھا۔اس قسم کی میکانکی تحقیق کے مقصد اور طریق کار سے آشکار ہے کہ اسے انجام دینے کے لیے کسی بڑی علمی قابلیت کی ضرورت نہیں۔ چونکہ غیر اسلامی نظریات کے تصورات کی طرف جھکنا اور اسلام کی بجائے ان کی حمایت خود کرنا اور دوسروں کو ان کی حمایت پر آمادہ کرنا ایک لاشعوری عمل ہوتا ہے اور جو لوگ اس عمل کا شکار بنتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ذہانت سے اسلام کی ایک نہایت ہی حیرت انگیز، اچھوتی اور دلکش تشریح دریافت کر لی ہے اور وہ اسے پیش کر کے اسلام کو بچانے اور ہر دلعزیز بنانے کی ایک نہایت ہی بے نظیر خدمت بجالا رہے ہیں جو دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

علمائے متقدمین کی اسلامی تحقیق ہمارے زمانہ کے چیلنج کا جواب نہیں بن سکتی

بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ اسلام کی سائنسی اور حکمیاتی تشریح جس کی ہمیں اس زمانہ میں ضرورت ہے، امام غزالی، شاہ ولی اللہ اور دوسرے مقتدر ائمہ دین کی اسلامی تحقیق کے اندر پہلے سے ہی موجود ہے اور اب ہمیں اسلام کی مزید کسی علمی تشریح کی ضرورت نہیں، لیکن یہ خیال درست نہیں۔ان بڑے بڑے ائمہ اور فضلا کی اسلامی تحقیق خواہ ان کے اپنے زمانہ کے علمی چیلنج کے جواب کے طور پر کیسی ہی گرانقدر اور کارآمد کیوں نہ ثابت ہوئی ہو، تاہم وہ جس صورت میں اِس وقت ہمارے سامنے موجود ہے، ہماری اس کوشش میں کہ ہم اسلام کی طرف سے اس زمانے کے علمی چیلنج کا کافی اور شافی جواب مہیا کریں، ہماری ذرا بھی مدد نہیں کر سکتی۔اِس زمانہ کے حکیمانہ تصورات اور نظریات جو اسلام سے ٹکراتے ہیں اور جن کی تردید پیش کرنا ہمارا فرض ہے مثلاً

مارکسزم، ڈاروزم، فرائڈزم، ایڈلرزم، میکڈوگلزم، بی ہیویرزم، لاجیکل پازیٹوزم وغیرہا جو عصر حاضر کی مخصوص علمی فضا کی پیداوار ہیں، اپنی نوعیت اور اپنے طرز استدلال کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں اور ہمارے بڑے بڑے متقدمین علماء اور فضلا ان سے قطعی طور پر نا آشنا تھے۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ وہ اپنی کتابوں میں ان کی تردید مہیا کر چکے ہیں حد درجہ کی سادگی ہے۔ چونکہ ہم ہی ان سے واقف ہوئے ہیں لہٰذا اسلام کی مدافعت کرنے اور اس کے علمی اور عقلی مقام کو بلند رکھنے کے لیے ان کی تردید بہم پہنچانا ہمارا ہی کام ہے۔ ہر دور کا علمی چیلنج مختلف ہوتا ہے اور اس کا جواب ان ہی مسلمانوں کو دینا ہوتا ہے جو اس دور میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اس چیلنج کا سامنا کر رہے ہوں۔

اس بات کے علاوہ، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، اسلامی تحقیق کے فاضل کا کام نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید کرے اور ان کو غلط ثابت کرے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے صحیح فلسفیانہ تصورات کی مدد سے جو صحیح ہونے کی وجہ سے لازماً اسلام کی تائید کریں گے، اسلام کو عقلی اور علمی لحاظ سے زیادہ دلکش، زیادہ مضبوط اور زیادہ یقین پرور بنائے۔ جس طرح سے اس دور کے غلط فلسفیانہ تصورات صرف اسی سے مخصوص ہیں۔ اسی طرح سے وہ صحیح فلسفیانہ تصورات بھی جو اس زمانہ میں آشکار ہوئے ہیں اسی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یہ ثانی الذکر تصورات اول الذکر تصورات میں اس طرح سے دبے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں جواہرات۔ جب تک ہم نئے کوڑے کرکٹ کو برباد نہ کریں ہم نئے جواہرات تک نہیں پہنچ سکتے۔ غرض ہمیں اس زمانہ میں اصلی اسلامی تحقیق کے کام کو نہ صرف اس لیے انجام دینا پڑے گا کہ ہم نئے علمی کوڑہ کرکٹ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ہم نئے علمی جواہرات کو، جو اس میں دبے پڑے ہیں، اپنے قبضہ میں لینا چاہتے ہیں۔

(جاری ہے)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد نعمان [۱]

جدید نصاب، دینی تقاضے اور مشترکہ نصابی خاکہ

مروجہ نصاب کو دینی تقاضوں اور ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اصلاحات اور نصاب کا مجوزہ خاکہ

حضرت علامہ جلال الدین عبدالرحمن السیوطی نے اپنی مشہور کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ قرآن کریم علوم کا منبع ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم قرآن میں رکھا ہے۔ اور اس میں ہر ہدایت وگمراہی کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ پس ہر استعداد والا قرآنی علوم پر اعتماد کرکے اپنے علم وظرف کے مطابق اس سے علم حاصل کرتا ہے۔ فقہاء اس سے احکام مستنبط کرتے ہیں اور حلال وحرام اس سے نکالتے ہیں۔ علم نحو والے قواعد واعراب میں قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ علم بیان والے حسن نظم اور علم بلاغت والے صوغ کلام اور علم تاریخ والے قرآن کے قصص اور اخبار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ [۲] اور علوم سائنس والے بھی اپنے علوم کے حصول کے لیے قرآن کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

جمیع العلم فِی الْقُرْاٰنِ لکن
تقاصر عنه افهام الرّجال

یعنی تمام علوم کی اصل و بنیاد قرآن ہی ہے لیکن لوگوں کے افہام کی رسائی کا قصور ہے۔

میں نے جہاں تک قرآن پاک کا مطالعہ کیا ہے۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق کے قصے میں مجھے دو قسم کے علوم عیاں نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے جب آدمؑ کی فضیلت فرشتوں پر ثابت کرنا چاہی تو اس میں دنیاوی علوم ہی کی نسبت سے فرشتوں پر فضیلت دی گئی جیسا کہ نظم قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے سوال کیا کہ مجھے ان اشیاء کے نام بتا دیجیے تو فرشتوں نے معذرت کی کہ اے اللہ! پاکی تیرے لیے ہے ہمیں تو اس چیز کا علم نہیں ہے۔

---

[۱] اسسٹنٹ پروفیسر ادارہ تعلیم وتحقیق، پشاور یونیورسٹی

[۲] علامہ جلال الدین عبدالرحمن السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۱/ ۳

ہمارے پاس تو صرف وہ علم ہے جو آپ نے عطا کیا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ارشاد فرمایا: کہ ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ تو حضرت آدمؑ نے فرفر تمام چیزوں کے اسماء اور کیفیت بیان کی، اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی فضیلت فرشتوں پر جتادی۔

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ان اسماء علم الاشیاء سے مراد دنیا کی کائنات کی اشیاء ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو دنیا ہی کے لیے خلیفہ بنا کر بھیجا تھا۔تو دنیا میں موجود کائنات سے استفادہ کا علم اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ودیعت کیا اور اب یہ دنیاوی علوم موروثی طور پر اولادِ آدم میں منتقل ہو گئے ہیں۔ جو کوئی زیادہ تحقیقات غور وفکر اور تدبر کرے گا اس پر یہ علوم کھلتے جائیں گے۔ اس لیے قرآن نے مسلمانوں کو زمین وآسمان کی تخلیق میں غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[illegible] [آل عمران ۳:۱۹۱] کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی مخلوقات جتنی بھی زمین وآسمان میں ہیں ان میں غور وفکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات وکمالات وسلطنت وجبروت ان پر عیاں ہوتی جاتی ہیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار اور ڈرنے والے بندے بن جائیں۔

جیسے مَیں نے پہلے عرض کیا یہ تمام علومِ دنیاوی موروثی طور پر آدمؑ کی اولاد میں منتقل ہو گئے ہیں۔ جو اس میں زیادہ محنت کرے گا وہ اس علم کو دریافت کرتا رہے گا۔ اور جو علوم اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ودیعت کیے اب تک ہم ان کی دریافت میں لگے ہیں۔لیکن جب حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ جنت سے نکال کر عالمِ دنیا میں بھیج رہے تھے، تو ارشاد فرمایا:

[illegible]
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ [البقرہ ۲:۳۸]

''ہم نے حکم فرمایا نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آوے تمہارے پاس، میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت سو جو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا اس پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔''(۱)

---

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی، مختصر ترجمہ بیان القرآن، گنج پرنٹرز لاہور

اس ہدایت سے مراد وحی الٰہی اور علوم نبوت ہیں اور بالفاظ دیگر شرعی علوم۔ اب اس علم نبوت نے انسانیت کی رہنمائی کی، کہ کس طرح وہ دنیاوی علوم سے استفادہ کرے گا۔ کیا اس کے لیے جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟ لہٰذا بنیادی علوم سے استفادہ کے لیے شرعی علوم ناگزیر ٹھہرے۔ اب ان دونوں طرح کے علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے، اور ہمارے اکابرین، صحابہ کرامؓ اور علماء عظام ان دونوں علوم کو حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

اعملوا لدنیا کم کانکم تعیشون ابدًا۔ (۱)

اصلحوا دنیا کم واعملوا لاٰ خرتکم کانکم تموتون غدًا۔ (۲)

اسلامی تاریخ پر اگر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوجائے گا کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعینؒ دنیاوی اور اخروی علوم میں کمال پیدا کرتے تھے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ طائف میں جدید آلات جنگ (منجنیق) استعمال کی ہے۔ (۳)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے دو صحابہ کرام عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ کو جرش (جو یمن میں واقع ہے) بھیجا تاکہ منجنیق، دبابہ اور صنبور ''جو اس زمانے میں جدید آلات حرب تھے'' میں مہارت حاصل کریں۔ (۴)

حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق و شام کا بندوبست یعنی پیمائش اراضی وغیرہ جو ہوا ابھی تک اسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے (۵)۔ جس کے لیے آج تحصیل دار اور پٹواریوں کو خاص ٹرینگ دی جاتی ہے۔ آگے چل کر حضرت امام غزالیؒ نے علوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا:

۱۔ علوم محمودہ ۲۔ علوم مذمومہ (۶)

علومِ محمودہ کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا:

---

(۱) الحدیث، بحوالہ الدیلمی

(۲) الحدیث، بحوالہ الدیلمی

(۳) سیرت ابن ہشام باب غزوۃ الطائف

(۴) ایضاً، جلد ۲

(۵) شبلی نعمانی، سیرت عمر فاروق، ص: ۳۰۷، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور

(۶) امام غزالی، اردو ترجمہ احیاء العلوم، منشی نولکشور، لکھنو، ص: ۲۰

۱۔ فرض عین ۲۔ فرض کفایہ

فرض عین وہ علوم قرار دیے جو ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہیں اور جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچا جاسکتا ہے[۱]۔جن کے بارے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم.[۲]

علوم فرض کفایہ کے بارے میں امام غزالیؒ کہتے ہیں:

وہ تمام علوم خواہ علم شریعت ہو یا دنیوی علوم ہوں پر امت مسلمہ کی اصلاح اور ترقی کا مدار ہو، وہ فرض کفایہ ہیں۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

علم شریعت میں کمال حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور علم طب، علم زراعت، علم حساب وہندسہ حتیٰ کہ بال کاٹنے کا علم بھی فرض کفایہ ہے۔ کیونکہ اگر بال کاٹنے کا فن کسی کو بھی معلوم نہ ہوتو انسان کا کیا حال ہوگا؟۔لہٰذا اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جملہ علوم جن پر امت مسلمہ کی ترقی کا انحصار ہو امت مسلمہ کے لیے ان کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔

دوسری قسم کے فرض کفایہ وہ ہیں جن کا سیکھنا ہر ایک کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ حسب ضرورت جماعت کے کچھ آدمی سیکھ لیں، تو اوروں کے سر سے بھی وہ فرض اتر جاتا ہے۔

امام صاحب نے فرض کفایہ کی دو قسمیں قرار دیں:

۱۔ علوم شرعیہ[۳] ۲۔ علوم دنیویہ

۱۔ علوم دنیویہ کے متعلق فرماتے ہیں:

LGãVø / mýï" @hç'Eänż`Ù pžśĎ'žrF j ŷ`Ù i ì mõâũ Lş`Ũölzó Yâý"`

کالطب انه هو ضروری فی حاجة بقاء الابدان، وکالحساب فانه ضروری فی

---

[۱] ایضاً

[۲] جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر الاندلسی، ۱/ ۳

[۳] امام غزالی، اردو ترجمہ احیاء العلوم، منشی نولکشور، لکھنو، ص: ۲۳

المعاملات وقسمة المواريث[۱]

''پس وہ تمام علوم فرض کفایہ ہیں جن کی حاجت امور دنیا کے قائم رکھنے میں پڑے جیسے طب کہ وہ تندرستی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے، یا جیسے حساب کہ معاملات اور وصیتوں اور ترکوں کی تقسیم وغیرہ میں اس کی حاجت ہوتی ہے۔''

صنعتی علوم وفنون کی تحصیل کی ترغیب

امام صاحب نے صنعتی علوم کی طرف سب سے پہلے پوری توجہ دلائی۔ امام صاحب نے کتاب احیاء العلوم میں طب، حساب، سیاست، پارچہ بافی، زراعت، حجامت وغیرہ وعلوم وفنون کی تحصیل کو فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ ان دنیاوی علوم کی نسبت لکھتے ہیں:

ALâ%LLHȘŨ"l'zб DŶâk ý # LÍ ǫǿDMōǚ' A" Lnøç k ý MXŗħ ıT'â`

اصول الصناعات ایضاً من فروض الکفایات کالفلاحة والمجالة والسیاسة بل الحجامة والخیاطة[۲]

''اس بات میں تعجب نہ کرنا کہ ہم نے طب اور حساب کو فرض کفایہ کہہ دیا ہے اس لیے کہ اس اعتبار سے اصل صنعتیں بھی فرض کفایہ میں داخل ہیں مثلاً باغبانی، کاشکاری اور سیاست، بلکہ حجامت اور سینے پرونے کے کام بھی فرائض میں شامل ہیں۔''

امام صاحب نے بڑی جرأت اور ہمت سے دینی اور دنیاوی علوم کی تقسیم اور ضروری اور غیر ضروری کی تصریح کر کے ایک روشن راہ عمل دکھادی جس پر چل کر نہ صرف مسلمانوں نے علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں ترقی کی بلکہ اقوام عالم میں سے بعض بیدار قوموں نے ان اصولوں کو مشعل راہ بنایا اور کامیابی حاصل کی۔[۳]

معقولات کی تعلیم

امام غزالیؒ نے از خود اپنے شوق سے فلسفہ ومنطق کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کیا۔ اس پر

---

[۱] ایضاً

[۲] ایضاً

[۳] انوار الحسن، ایم۔اے۔ امام غزالی کے تعلیمی نظریات واصلاحات، دین محمدی پریس لاہور

پورا عبور حاصل کیا۔اس کے بعد ان خرابیوں پر گہری نظر ڈالی جو فلسفہ کے عام رواج میں پیدا ہوگئی تھیں۔امام صاحب نے تہافتہ الفلاسفہ میں مذکورہ خرابیوں کا ذکر کیا ہے،جس کا ترجمہ مولانا شبلی نے یوں کیا ہے:

''ہمارے زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ ان کے دل ودماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہیں۔ یہ لوگ مذہبی احکام وقیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ حکماءقدیم مثلاً افلاطون،ارسطو وغیرہ مذہب کو لغو سمجھتے تھے۔اور چونکہ یہ حکماء تمام علوم وفنون کے بانی اور موجد تھے اور عقل وذہن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہوا اس لیے ان کا انکار مذہب اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ مذہب حقیقت میں لغو وباطل ہے۔ اور اس کے اصول وقواعد فرضی ومصنوعی ہیں جو صرف ظاہر میں خوشنما اور دلفریب ہیں۔اس بناء پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکماء نے الٰہیات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال ہیں۔''

اس طرح امام غزالیؒ کے زمانہ سے معقول ومنقول کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونے لگی۔[1]

عفیف عبدالفتاح طبارہ''روح الدین الاسلامی''میں لکھتے ہیں:

''کیا مراد ہے اس علم سے جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے؟ کیا وہ فقط دینی علم ہے جیسا کہ بعض کا گمان ہے؟ نہیں بلکہ مراد ہے ہر وہ علم جس سے جہل ختم ہو،خواہ وہ امور دینیہ میں سے ہو یا مادی اشیاء کا علم ہو۔پس علوم طبیعیہ وعلم النفس وعلم التاریخ وجغرافیہ وغیرہ وہ علوم ہیں جن کو قرآن نے مقصدی علوم ٹھہرایا ہے۔اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دینی علوم کے حصول پر ابھارتا ہے[2]۔تاکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت وجلال اور صفتِ تخلیق کی معرفت پیدا ہو۔

(جاری ہے)

---

[1] الغزالی،علامہ شبلی نعمانی،گنج شکر پرنٹرز لاہور،ص:۱۰۷

[2] عفیف عبدالفتاح طبارہ،روح الدین الاسلامی،ص:۲۷۵

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب سے مکالمہ

انتخابی جدوجہد اور غلبۂ دین

سید مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی فکر۔ایک تجزیہ

[ہم نے پچھلے ماہ کے البرہان میں ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا مضمون شائع کیا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اگلے شمارے میں اس کا جواب دیں گے چنانچہ جواب حاضر ہے۔سابقہ مضمون کا اسلوب برقرار رکھتے ہوئے موضوع کے فکری پہلوؤں کا احاطہ ہم کریں گے اور عملی سیاسی پہلوؤں پر گفتگو پروفیسر طارق بٹ صاحب کریں گے۔مدیر]

۱۔ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب بزرگ، نیک، مخلص اور محنتی دانشور ہیں۔ وہ اس لحاظ سے ہمارے فکری حلیف ہیں کہ کراچی میں ان کا حلقۂ فکر مغربی فکر وتہذیب کے خلاف ایک بڑا مورچہ ہے اور ہم لاہور میں یہی دیا جلائے رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے اور ان کے فکری اشتراک کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہم اور وہ دینی قوتوں کے اتحاد اور معاشرتی تنظیم کے ذریعے مسجد کو مرکز بنا کر جہالت، بدامنی، بے انصافی اور غربت کے خلاف جدوجہد کے قائل اور داعی ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ وہ مولانا مودودیؒ کے محب اور جماعت اسلامی کے حامی اور مویّد ہیں اور جماعت کو سیاسی میدان میں کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اور ہم بھی جدید دینی تحریکوں کے مؤید، سید مودودیؒ کی عظمت فکر وعمل کے قائل اور جماعت اسلامی کے بہی خواہ ہیں۔ اختلاف رائے اس امر میں ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی اپنی موجودہ سیاسی انتخابی جدوجہد کے ذریعے پاکستان میں غلبۂ دین کا مقصد حاصل کرسکتی ہے اور یہی مولانا مودودیؒ کی حکمت عملی تھی۔ جبکہ ہماری رائے اس کے برعکس ہے۔

ہم اپنا موقف البرہان میں کئی دفعہ زیرِ بحث لا چکے ہیں لیکن لگتا ہے کہ محترم ڈاکٹر انصاری صاحب کی نظر سے ہماری تحریریں نہیں گزریں۔ بہرحال تازہ بحث کی تکمیل کی خاطر ہم اپنا موقف ایک بار پھر پیش کیے دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ محترم ڈاکٹر صاحب اور جماعت اسلامی کے احباب اس اختلافی بحث کا خوش دلی سے مطالعہ کریں گے۔

چونکہ ڈاکٹر انصاری صاحب کہتے ہیں کہ انتخابی سیاست کے حق میں جو موقف وہ پیش

کررہے ہیں وہ مولانا مودودیؒ کی فکر پر مبنی ہے اور یہی جماعت اسلامی کے موقف کے عین مطابق ہے، لہٰذا مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں۔ اسلام، مغربی جمہوریت اور پاکستان میں غلبۂ دین بذریعہ جمہوری انتخابات کے حوالے سے پہلا حصہ مولانا کی فکر کے بارے میں اور دوسرا حصہ مولانا کے بعد پاکستان میں غلبۂ دین کے لیے جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد کے حوالے سے۔

مبحث اوّل: اسلام، مغربی جمہوریت اور پاکستان میں غلبۂ دین بذریعہ انتخابی جدوجہد کے حوالے سے مولانا مودودیؒ کی فکر

پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں کے مخصوص حالات تھے کہ خلافت ختم ہو چکی تھی، مسلمان مغلوب ہو چکے تھے، ان کی اجتماعی قوت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور کوئی بڑی مسلم ریاست باقی نہ رہی تھی جبکہ مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک ہر سو غالب تھے۔ ان حالات میں سید مودودیؒ نے 'اقامت دین' کا نظریہ پیش کیا کہ انفرادی مسلمانی کافی نہیں بلکہ دین کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی زندگی پر بھی دین کا غلبہ ہو، اسلامی ریاست وجود میں آئے اور اقتدار کفار و فساق و فجار کے ہاتھوں سے نکل کر صالحین کے ہاتھوں میں آ جائے۔ مولانا نے اس ہدف کو دین کا حاصل اور نصب العین قرار دیا اور اس کے لیے آیات و احادیث کی مخصوص تشریح کر کے اسے علمی استناد مہیا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان اس وقت اکثر و بیشتر مغربی استعمار کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے اور آزادی کے لیے حسب موقع وضرورت پُر امن جدوجہد کر رہے تھے یا مسلح مزاحمت میں مصروف تھے۔

دریں صورت کئی اہل علم نے مولانا کے اسلوب دعوت کی تعریف کی جو مغرب زدہ نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق تھا اور انہیں مغربی تہذیب کی مرعوبیت سے نکال کر اسلام کی طرف پلٹنے میں معاون ہو رہا تھا۔ تاہم روایتی علماء اور دینی جماعتیں اگرچہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر عمل اور اسلامی ریاست کے قیام پر متفق تھیں لیکن ان کی اکثریت نے مولانا کے اقامت دین کے مخصوص تصور اور اس کے لیے وضع کردہ علم کلام کی مخالفت کی کیونکہ ان کی رائے میں یہ دین کی سیاسی تعبیر تھی اور سیاست کو دین اور دین کو سیاست کے مساوی سمجھنے کا عمل تھا جس سے دین کے دوسرے اہم اجزاء سے صَرف نظر ہوتا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بہت سوں

نے اسے دین میں مبالغہ اور تحریف سمجھا۔

اس دوران مولانا نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کر لی تا کہ اقامت دین کے لیے اجتماعی جدوجہد کی جا سکے۔ مولانا نے اس کے لیے جو حکمت عملی وضع کی وہ یہ تھی کہ دعوت دین اور اصلاح فرد و معاشرہ کے لیے کام کیا جائے اور اس کام کو اتنا بڑھایا اور پھیلایا جائے کہ سوسائٹی میں ایک تغیر پیدا ہو اور اس کے منطقی انجام کے طور پر لوگوں کی حمایت سے اسلامی ریاست وجود میں آئے جس کی باگ ڈور صالحین کے ہاتھ میں ہو۔[۱]

اس دوران مغربی فکر و تہذیب کے حوالے سے مولانا کا موقف یہ تھا کہ یہ جاہلیت خالصہ ہے۔[۲] اور آپ نے اس کے خلاف تند و تیز مضامین لکھے جو آپ کی کتاب 'تنقیہات' میں شائع ہوئے۔ مغرب کی سیاسی فکر کے ایک اہم ستون نیشنلزم یا وطن پرستی کے خلاف آپ نے مہم چلائی اور ان علماء کی مخالفت کی جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ ہندوستان کے حق میں سیاسی جدوجہد کر رہے تھے۔ آپ نے کہا کہ وطن کی بنیاد اس کا اسلامی اور نظریاتی بنیاد پر استوار ہونا ہے نہ کہ مغربی اصولوں کے مطابق اشتراک رنگ و نسل اور علاقے و زبان کے مشترک ہونے پر۔ جماعت بنانے کے بعد مولانا نے انگریز کی ملازمت اور اس کی عدالتوں سے رجوع کو غیر اسلامی قرار دے دیا۔

مندرجہ بالا نقطۂ نظر مولانا کا قیام پاکستان سے پہلے تک تھا اور جماعت اس کے مطابق مصروف جدوجہد تھی کہ مسلم لیگ کی جدوجہد سے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا، ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور مولانا اور جماعت کو مشرقی پنجاب کے قصبہ پٹھان گوٹھ سے لاہور ہجرت کرنا پڑی۔

مولانا مودودیؒ کے دو اجتہادی فیصلے

قیام پاکستان کی وجہ سے صورت حال میں یہ بنیادی تبدیلی آئی کہ اب مسلمان نہ برطانیہ کے غلام رہے تھے اور نہ انہیں بڑی ہندو اکثریت کا سامنا تھا بلکہ پاکستان ایک مسلم مملکت تھی جس میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مسلم لیگی قیادت نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا

---

[۱] دیکھیے ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودیؒ کی علی گڑھ میں تقریر جو 'اسلامی ریاست کس طرح قائم ہوتی ہے؟' کے عنوان سے پمفلٹ کی صورت میں جماعت شائع کرتی ہے۔

[۲] دیکھیے پمفلٹ 'اسلام اور جاہلیت'

وعدہ کیا تھا اور عوام میں اس حوالے سے جوش وخروش تھا لہٰذا مولانا مودودیؒ نے سوچا کہ دعوت دین اور اصلاح فرد ومعاشرہ کے ذریعے قیام اسلامی ریاست کی بجائے اب براہ راست سیاسی جدوجہد کے ذریعے پاکستان کو مکمل اسلامی ریاست بنانے کی کوشش کی جائے۔ تاہم انہوں نے اس موقع پر یہ بھی لکھا کہ اگر ہمارا یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا تو ہم اپنے پہلے موقف (قیام اسلامی ریاست واقامت دین بذریعہ دعوت دین اور اصلاح فرد ومعاشرہ) کی طرف لوٹ جائیں گے۔ (ہم مولانا کی متعلقہ تحریر بطور ضمیمہ شائع کررہے ہیں۔)

کئی اہل علم کے نزدیک مولانا کا یہ فیصلہ نقلاً درست تھا نہ عقلاً کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کی براہ راست نگرانی میں دین کو غالب کرنے کے لیے جو جدوجہد کی اس کی بنیاد دعوت واصلاح پر تھی [illegible] [البقرہ ۲: ۱۲۹] یعنی پہلے آدمی کو بدلا جائے، انسانوں کی تعلیم وتربیت پر محنت کی جائے۔ انہیں تجربات اور سختیوں سے گزرنے کا موقع ملے تاکہ ان کا مخلص اور مستحق نصرتِ الٰہی ہونا ثابت ہوجائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیرہ سال تک مکہ میں انسان سازی کا یہ کام کیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت سے ایسے افراد کی ایک قابل بھروسہ جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جو بعد میں ہر آزمائش میں پورا اُتری اور اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ بنی۔ لہٰذا غلبہٗ دین کا الٰہی اور نبوی منہج یہ ہے کہ پہلے دعوت واصلاح اور تعلیم وتزکیہ کے ذریعے افراد کو بدلا جائے اور پھر ان افراد کے ذریعے معاشرے اور ریاست کو بدلا جائے۔

عقلاً یہ بات اس لیے غلط تھی کہ آپ جس جمہوریت اور نظام انتخاب کو قبول کرنے چلے تھے اس میں کامیابی کا انحصار اس بات پر تھا کہ آپ کو عوام کی حمایت حاصل ہو، وہ آپ کے ہم خیال ہوں، وہ اپنے آپ پر اسلام نافذ کرنے کے مشتاق ہوں اور معاشرے اور ریاست کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لیے پرعزم ہوں اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے پر تیار ہوں۔ ظاہر ہے یہ کام بڑے پیمانے پر دعوت واصلاح اور تعلیم وتربیت کی محنت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اگر آپ یہ بنیادی کام کیے بغیر عوام کے پاس ووٹ لینے پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کو ووٹ کیوں دیں گے؟

دوسرا اجتہاد

دوسرا بڑا مسئلہ جس میں مولانا کو اجتہاد کرنا پڑا وہ مغربی جمہوریت کے بارے میں تھا۔ سارے اہل علم جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ:

۱۔ مغربی فکروتہذیب جاہلیت خالصہ ہے۔ اس کی بنیاد ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم.... پر ہے اور یہ نظریات مل کر جو ورلڈ ویو (تصورِ انسان، تصورِ الٰہ، تصورِ کائنات اور تصورِ علم) بناتے ہیں وہ سوفی صد غیر اسلامی ہے کیونکہ اس کی رو سے انسان مختار مطلق ہے اور وہ کسی کا عبد نہیں۔ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ہے تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں اس کی پوجا پاٹ کر لے لیکن انسانوں کی عملی اور اجتماعی زندگی میں اللہ و رسول اور مذہب کو مداخلت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور یہی ہماری ساری جدوجہد کا ہدف ہونی چاہیے۔ وحی کوئی چیز نہیں اور حقیقی علم وہ ہے جو انسان مشاہدے اور تجربے سے حاصل کرتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام کا ورلڈ ویو یہ ہے کہ اللہ خالق و مالک و رازق و پروردگار اور واحد معبود ہے۔ انسان اس کا عبد ہے جس کا بنیادی فریضہ اللہ کی عبادت و اطاعت اور اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ یہ دنیا عارضی اور دارالامتحان ہے اور اس کے بعد ایک دوسری دنیا آنے والی ہے۔ انسانی زندگی کا لائحہ عمل وہ ہدایت طے کرتی ہے جو وحی پر مبنی ہوتی ہے....

اس مختصر تقابل سے ظاہر ہے کہ مغربی فکر و تہذیب ایک الگ پیراڈائم (دائرہ فکر و عمل، طرز زندگی، اسلوبِ حیات) ہے اور اسلام اس سے مختلف و متضاد دوسرا پیراڈائم ہے اور یہ دونوں چونکہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے اور ان کے درمیان تلفیق (Merger) ممکن نہیں۔

مثلاً مغرب کے سیاسی نظام کو لیجیے۔ یہاں حاکمیت اعلیٰ انسان کو حاصل ہے جو مختار مطلق ہے اس کا اظہار پارلیمنٹ کی بالادستی میں ہوتا ہے کیونکہ وہ مختار مطلق انسان کے نمائندوں کی جگہ ہے لہٰذا وہ جو قانون چاہیں بنا سکتے ہیں، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور انہوں نے کیا بھی ہے اور زنا، شراب نوشی، جوئے، ہم جنس شادیوں اور نکاح کے بغیر عورت مرد کے اکٹھے رہنے کو قانونی قرار دیا ہے۔ مغرب کے سیاسی نظام میں آئین مقدس ترین دستاویز ہوتی ہے اور ریاست کے سارے ادارے اس کے اتباع کے پابند ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان انسانوں اور ان کے نمائندوں نے بنایا ہوتا ہے جو مختار مطلق اور حاکم اعلیٰ ہوتے ہیں۔ کسی علمی اور اخلاقی معیار سے قطع نظر یہاں ہر انسان کا ووٹ برابر ہوتا ہے (خواہ وہ جاہل و بدمعاش ہو یا نیک اور عالم)۔ یہاں نمائندگی حاصل کرنے کے لیے آپ دولت کے دریا بہا سکتے ہیں اور امیدوار بن کر اپنے منہ

میاں مٹھو بن سکتے اور خود کو فرشتہ صفت ثابت کر سکتے ہیں۔ رنگ، نسل، علاقے، مسلک، خاندان اور برادری کے تعصب کی بنیاد پر ووٹ مانگ سکتے ہیں۔ مغرب کا یہ سیاسی نظام 'جمہوریت' کہلاتا ہے جس میں مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق انتخابات ہوتے ہیں اور جیتنے والے عوام کے نمائندے ان اصولوں کے مطابق حکومت اور ملک کا نظام چلاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں جو اسلام کا سیاسی نظام ہے، ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جاتے کیونکہ ایک عامی مسلمان بھی سمجھ سکتا ہے کہ مغربی جمہوریت کے یہ سارے اصول غیر اسلامی ہیں اور مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہیں۔

۲۔ اصطلاحات ہمیشہ کسی تہذیب کے بنیادی نظریات، ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی پیداوار ہوتی ہیں اور اگر دو تہذیبیں اور ان کے ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم ایک دوسرے سے متضاد ہوں تو ان کی مصطلحات بھی اپنے متضمنات اور مفاہیم میں ایک دوسرے کی ضد ہوں گی اور ان دونوں کو ملا یا نہ جا سکے گا مثلاً اسلام میں 'صلاۃ' کا جو مفہوم ہے وہ 'Prayer' میں موجود نہیں اور نہ اس میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں 'دِیت' کا جو مفہوم ہے، Blood Money کے الفاظ اس کے سارے مفاہیم کا احاطہ نہیں کرتے۔ اسی طرح اسلام میں 'شورائیت' کا جو مفہوم ہے اسے 'مغربی جمہوریت' پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی کرے تو یہ قیاس مع الفارق ہوگا اور غلط ہوگا۔

اس کے باوجود مولانا مودودیؒ نے مغرب کی لادین جمہوریت کو جو ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریل ازم اور کیپیٹل ازم جیسے کفریہ نظریات کی پیداوار تھی جنہیں وہ ماضی میں جاہلیت خالصہ قرار دے چکے تھے، اس میں چند اسلامی اصول داخل کر کے اس کو مشرف بہ اسلام کر لیا اور اسے 'اسلامی جمہوریت' کہہ کر قبول کر لیا اور نہ صرف یہ بلکہ اس کے تحت انتخابات کو پاکستان میں اقامت دین اور غلبۂ دین کا ذریعہ بھی قرار دے دیا۔

مولانا کے اجتہادات پر ردّعمل

مولانا کے ان دو اجتہادات پر ردعمل کیا ہوا؟ پہلے اجتہاد کو خود جماعت کے اکابر علماء اور دانشوروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ماچھی گوٹھ کے اجتماع کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، حکیم عبدالرحیم اشرف، ڈاکٹر اسرار احمد اور دوسرے زعماء جماعت کو چھوڑ گئے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا کہ مولانا کے تجویز کردہ راستے پر چلنے کے نتیجے میں جماعت محض ایک سیاسی جماعت بنتی جاری ہے اور دعوت دین اور اصلاح فرد و معاشرے کا کام پس پشت چلا

گیا ہے۔ البتہ مولانا کے دوسرے اجتہاد کو علماء نے قبول کرلیا اور روایتی دینی جماعتوں نے بھی اسلامی جمہوریت کو قبول کر کے جمہوری انتخابات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

اس نقطۂ نظر کو مغرب نے بھی خوش آمدید کہا اور اس کی حمایت کی کیونکہ اس طرح دینی عناصر گویا مغرب کی پچ پر کھیلنے کے لیے تیار ہو گئے اور یہ نظام چونکہ ان کا تھا لہٰذا انہیں پتہ تھا کہ کس طرح وہ مختلف حربے استعمال کر کے دینی عناصر کو بآسانی شکست دے سکتے تھے۔ چنانچہ مقامی حکمرانوں کو ساتھ ملا کر اور دینی عناصر کو آپس میں لڑا کر وہ انہیں ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے اور خصوصاً دوسری دینی سیاسی جماعتوں کو جماعت اسلامی کے خلاف کھڑا کر کے جماعت کو سیاسی میدان میں شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

اجتہاد کی عظمت اور صحت کا مسئلہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی عالم کے اس کے کسی اجتہاد کے صحیح نہ ہونے پر اس پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ سید مودودیؒ بلاشبہ ایک متبحر عالم تھے، دانش ور، مفکر اور متکلم تھے۔ ان کی دینی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کی جلالت علمی کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کے کسی اجتہاد کے صحیح نہ نکلنے پر ان کی عظمت میں کوئی کمی آتی ہے۔ اجتہاد ایک عظیم منہج ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو عالم یا حاکم اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد صحیح نکلے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور اگر اس کا اجتہاد صحیح نہ نکلے تو اس کے لیے اکہرا اجر ہے۔[1]

دوسری بات یہ ہے کہ کیسے پتہ چلے کہ کسی عالم کا اجتہاد صحیح ہے یا نہیں؟ اس کے دو حل ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ اگر کسی مسئلے کے دو حل سامنے آ رہے ہوں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کا موقف اوفق بالقرآن والسنۃ ہے اور کس کی شرعی دلیلیں قوی تر ہیں اور صحابہ وسلف اور جمہور علماء کے نزدیک زیادہ معتبر ہیں؟ اور دوسرا معیار یہ ہے کہ جس مسئلے کو حل کرنے کے لیے وہ اجتہاد کیا گیا تھا اس سے وہ مسئلہ حل ہوا یا نہیں اور اس سے مطلوبہ نتائج نکلے یا نہیں؟

مولانا کے پہلے اجتہاد کا نتیجہ

اس لحاظ سے اگر ہم مولانا مودودیؒ کے مذکورہ بالا دونوں اجتہادوں کو دیکھیں تو پہلے اجتہاد

---

[1] صحیح بخاری، بَابُ أَجْرِ الحَاكِمِ إِذَا اجْتَهَدَ فَأَصَابَ أَوْ أَخْطَأَ، حدیث نمبر: ۷۳۵۲

کے مطلوبہ نتائج نہیں نکلے۔اور مولانا مودودیؒ چونکہ ایک ذہین آدمی تھے اور اپنی کاز کے لیے مخلص بھی تھے لہٰذا وہ اپنی کوششوں اوران کے حاصلات کا جائزہ لیتے رہے۔ہمیں سید اسعد گیلانی مرحوم (سابق رکن شوریٰ وعاملہ، امیر جماعت اسلامی پنجاب/ لاہور ورکن قومی اسمبلی) نے خود بتایا کہ ایک دفعہ میں مولانا مودودیؒ کے ساتھ جماعت کے معاملات پر گفتگو کررہا تھا تو میں نے کہا کہ ''مولانا! کیا جماعت اسلامی آج اُسی طرح کی سیاسی جماعت نہیں بن گئی جس طرح کی مسلم لیگ ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی؟'' تو مولانا نے نظریں جھکا لیں اور خاموش ہو گئے۔

بالآخر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت کی بری طرح ناکامی کے بعد مولانا نے اپنے موقف پر نظر ثانی کا فیصلہ کرلیا۔اور اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انتخابات تبدیلی کا واحد ذریعہ نہیں۔ یہ تقریر الطاف حسن قریشی اور مجیب الرحمن شامی کے ہفت روزہ' طاہر' میں چھپی جس کا عکس ہم ضمیمہ میں دے رہے ہیں۔ پھر مولانا نے جماعت کی شوری میں تفصیل سے اپنا موقف رکھا۔اس کی کچھ تفصیلات حیدرآباد کے مولانا وصی مظہر ندویؒ نے (جو اس وقت شوری کے رکن تھے) اپنے اس انٹرویو میں دی ہیں جو انہوں نے مئی ۱۹۸۳ء میں روزنامہ نوائے وقت کو دیا تھا۔اس میں مولانا ندوی نے کہا:

''مولانا مودودیؒ بھی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچ چکے تھے(کہ انتخابات کے ذریعہ سے اسلامی نظام کا قیام عمل میں نہیں آسکتا) دسمبر ۱۹۷۵ء کی جماعت کی شوریٰ میں شدید علالت کے باوجود بیس منٹ کی جو مختصر تقریر انہوں نے کی تھی، اس میں انہوں نے صاف صاف کہا تھا کہ میں نے بالغ رائے دہی کی وکالت کی ہے لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میری غلطی تھی اور یہ امت کی قسمت کو جاہلوں کے حوالے کردینا ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے یہ بات بھی کہی تھی کہ اس ملک میں آج تک جو شخص نمبر دو پر کھڑا تھا اسی نے جگہ سنبھال لی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں اس بات کی زیادہ وضاحت نہیں کرنا چاہتا تھا۔آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ نمبر دو پر کھڑے ہونے سے میری مراد کیا ہے؟ مولانا مودودیؒ کی یہ تقریر شوریٰ کی کاروائی میں مکمل طور پر درج ہے.....''

اگلے سوال کے جواب میں مولانا وصی مظہر ندوی نے جواب دیا۔

''میرے پاس شواہد موجود ہیں کہ مولانا مرحوم اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جماعت کی قیادت سے قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔ ایک بار تو نوبت یہاں تک آئی کہ مولانا مودودیؒ کو ان

قائدین کے خلاف اخبارات میں بیان جاری کرنا پڑا جس میں انہوں نے میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ جماعت اسلامی کو چلانے کے لیے لیڈر بنائے گئے ہیں جماعت کو ختم کرنے کے لیے نہیں۔ جماعت کے رہنماؤں نے اس بیان کو Kill کرانے کی بے حد کوشش کی لیکن وہ بعض اخبارات میں شائع ہو ہی گیا۔“

اس حوالے سے ان کی مولانا مودودیؒ سے خط و کتابت بھی ہوئی جس میں سے مولانا کے ان کے نام دو خطوط کی عکسی نقل ہم ضمیمہ میں دے رہے ہیں۔

لیکن.... جن لوگوں کو خود مولانا نے انتخابی سیاست کی راہ پر ڈالا تھا، وہ مولانا کی بات کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے مولانا کی رائے کو قبول نہ کیا۔ مولانا کو اس سے گہرا صدمہ پہنچا لیکن چونکہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور بیمار اور کمزور تھے لہٰذا نئی بنیادوں پر کوئی تحریک از سر نو کھڑی کرنے کے قابل نہ تھے۔ اور چونکہ جماعت ان کی زندگی بھر کی محنت کا ثمر تھی لہٰذا وہ اسے انتشار میں مبتلا کر کے کمزور بھی نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

جماعت کے ایک معروف اور ذمہ دار رکن نے (جو الحمدللہ بقید حیات ہیں) ہمیں بتایا کہ ایک دفعہ انہوں نے قاضی حسین احمدؒ سے پوچھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ نے شوری میں اپنے خطاب میں کہا تھا کہ جماعت کو انتخابی سیاست کی بجائے اصلاح فرد و معاشرہ کی طرف پلٹ جانا چاہیے، کیا یہ تاثر درست ہے؟ قاضی صاحب مرحوم نے جواب دیا کہ ہاں۔ اب بھی ارکان جماعت میں سے کوئی اس موضوع پر تحقیق کرنا چاہے تو وہ مرکز جماعت کے شعبۂ تنظیم سے شوری کی متعلقہ روداد نکلوا کر دیکھ سکتا ہے یا اُس زمانے کے ارکان شوری کے نام دریافت کر کے، ان میں سے جو اصحاب زندہ ہوں، ان سے دریافت کر سکتا ہے۔

مبحث دوم: جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد

مولانا کے بعد جماعت کی قیادت نے انتخابی سیاست کے پروگرام کو جاری رکھا۔ وہ ہر الیکشن میں ناکام ہوئے اور اب ان کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ وہ چند سو ووٹ لیتے ہیں اور ان کی ضمانت ضبط ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ انتخابی سیاست چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کارکن مایوس ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور یہ بھی کہ اب جماعت اسلامی محض ایک سیاسی جماعت بن کر رہ گئی ہے اور دعوت و اصلاح اور اصلاح فرد و معاشرہ کی باتیں منصوبوں اور کاغذوں

میں ضرور لکھی ہوتی ہیں لیکن عملاً کوئی بڑا کام نہیں ہو رہا۔

ہم جماعت کے احباب سے کہتے ہیں کہ انہیں انتخابی سیاست کے حوالے سے مولانا مودودیؒ کی نظرثانی شدہ رائے مان لینی چاہیے۔ اگر قیادت نہیں چاہتی کہ اس فیصلے کا سارا بوجھ وہ خود اٹھائے تو وہ ارکان کو باہم مشاورت کی اجازت دے کر اور ریفرنڈم کرا کر ان کے فیصلے پر عمل کر سکتی ہے۔

اور اگر مستقل نہیں تو جماعت کم از کم آئندہ دس پندرہ سال کے لیے انتخابی سیاست روک کر، یا سیاسی جدوجہد کم کر کے، دعوت دین اور جماعت کی دعوت جم کر اور محنت سے لوگوں تک پہنچائے تاکہ لوگ جماعت کے پروگرام کو سمجھیں اور اس کی حمایت کریں۔

بعض لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جماعت نے انتخابی سیاست چھوڑ دی تو گویا اس نے اقامت دین، انقلاب امامت اور قیادت کے صالح ہاتھوں کو منتقلی کا راستہ چھوڑ دیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ میدان میں اترنے سے پہلے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم جو تجویز دے رہے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ انتخابی سیاست میں اترنے سے پہلے آپ تیاری کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصر، انڈونیشیا، فلسطین وغیرہ کی طرح جماعت خود دعوت واصلاح اور اصلاح فرد و معاشرہ کے کام پر محنت کرے اور اپنی ایک سیاسی جماعت بنا لے۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ انقلاب امامت کا ایک ہی طریقہ انتخابی سیاست نہیں ہے اور نہ یہ قرآن و حدیث میں کہیں لکھا ہے کہ انتخابی سیاست کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ جب آپ سوچنے بیٹھیں گے تو کئی دوسرے طریقے آپ کو سوجھیں گے جو زیادہ قابل عمل ہو سکتے ہیں۔ (ہم بھی کئی طریقے تجویز کر سکتے ہیں لیکن یہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے۔ ہم یہاں اگر اس کی تفصیل میں گئے تو خلط مبحث ہوگا)۔

مولانا کا دوسرا اجتہاد

مولانا کا دوسرا اجتہاد کہ انہوں نے جاہلیت خالصہ کی پیداوار اور مغرب کی سیاسی نظام کے اہم جزو جمہوریت میں کچھ اسلامی اصولوں کی پیوند کاری کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' بنا لیا، یہ بھی غلط ثابت ہوا۔ ہم اس کے نقلی اور عقلی دلائل کچھ اوپر ذکر کر چکے اور کچھ مزید یہاں عرض کرتے ہیں۔

❁ خلافت کے خاتمے، غلامی اور دور زوال کے بعد جب مسلم ممالک آزادی حاصل کر رہے تھے تو ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ سماجی علوم جن کا عملی زندگی سے گہرا تعلق ہے جیسے

سیاسیات، معاشیات، تعلیم، قانون، نفسیات وغیرہ، ان میں نیا اجتہاد کیا جاتا کیونکہ صدیوں پہلے کے اجتہادات اب زیادہ کارآمد نہ رہے تھے اور پھر اب مسلمانوں کا مقابلہ ایک غالب اور بالا دست الحادی فکر وتہذیب سے تھا.... لیکن سید مودودیؒ اور دوسرے اہل علم نے اس چیلنج کو قبول کرنے کی بجائے یہ آسان راستہ اختیار کیا کہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی پیداوار مغربی جمہوریت کو قبول کر کے اور اس میں چند اسلامی اصولوں کی پیوند کاری کر کے اسے ’اسلامی جمہوریت‘ قرار دے دیا اور اس پر عمل شروع کر دیا اوا پنی سادگی، خوش فہمی اور خوش امیدی میں یہ توقع بھی باندھ لی کہ اس سے پاکستان میں اسلام کا غلبہ ہو جائے گا حالانکہ یہ نقلاً اور عقلاً اُس وقت بھی درست نہیں تھا بلکہ

❁ Yo zzoY p Zz yo Z o p zoZ zgt p Zz ïµnzÿu fo k yaLn,U@ iD' YAPdnfi k yD [آل عمران ۳: ۸۵] کے تحت مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو رد کرنا ضروری تھا کیونکہ اس کا غیر اسلام اور ماسوا اسلام ہونا ظاہر وباہر تھا اور ہے۔

❁ اگر مغرب کا کوئی ادارہ غیر اقداری (Value-Neutral) ہوتا تو اس کو قبول کرنے کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا اور سوچا جاسکتا ہے کہ اسے قبول کر کے اور اپنے حالات اور نظریات کے مطابق اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے اپنا لیا جائے۔ لیکن مغربی جمہوریت تو براہ راست ہیومنزم، سیکولرزم، کیپیٹل ازم کی پیداوار تھی اور اس کے غیر اسلام اور خلاف اسلام ہونے کے بارے میں کوئی دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی تھی الا یہ کہ کوئی تجدد سے اسے اسلامی کور (Cover) مہیا کر کے ایک غیر اسلامی چیز کو اسلامی باور کرنا اور کرانا شروع کر دے۔

❁ اور اس اجتہاد کے صحیح نہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس برائے نام ’اسلامی جمہوریت‘ کے نتیجے میں ملک میں اسلام کا غلبہ نہیں ہوا بلکہ مغربی فکر وتہذیب (سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریلزم، کیپیٹل ازم....) کا غلبہ ہو گیا ہے اور پاکستانی فرد، معاشرہ اور ریاست دن بدن اسلام سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہو چکی ہیں اور بگاڑ وفساد کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ دینی اصلاحی تحریکوں اور اداروں کا کام بھی غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے۔

اگر کوئی ہمارے اس موقف پر یہ اعتراض کرے کہ جب مغربی جمہوریت یا برائے نام ’اسلامی جمہوریت‘ ہی ملک میں رائج ہو اور اس کے علاوہ عملی سیاسی جدوجہد کا کوئی اور راستہ کھلا ہی نہ ہو تو اس جمہوریت کو قبول کرنا مجبوری ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ عذرِ لنگ ہے کیونکہ اس موقف نے

نہ صرف دینی قوتوں کو ناکام کیا ہے بلکہ صحیح اسلامی سیاسی جدوجہد کا (بلکہ سارے شعبہ ہائے زندگی کی اسلامائیزیشن کا) راستہ بھی روک دیا ہے۔

دیکھیے! اگر آپ مغربی جمہوریت یا برائے نام 'اسلامی جمہوریت' کو رد کر دیتے تو ملک میں غلبۂ دین کے لیے دیگر راستوں اور تجاویز کے بارے میں سوچتے اور ان پر عمل کرتے۔ اور اگر آپ اس مغربی جمہوریت میں یہ کہہ کر حصہ لیتے کہ ہم اسے غیر اسلامی سمجھتے ہیں لیکن بگاڑ اور فساد کو بڑھنے سے روکنے کے لیے اس میں مجبوراً حصہ لے رہے ہیں اور ساتھ ہی آپ غلبۂ دین کے لیے متبادل مناہج پر غور کرتے اور ان پر عمل کرتے تو اس کے نتیجے میں غلبۂ دین کے امکانات بڑھ جاتے۔ لیکن جب آپ نے باقی سارے کام چھوڑ دیے (گو برائے نام کاغذوں میں باقی رہے) اور صرف مغرب زدہ 'اسلامی جمہوریت' کے تحت جدوجہد کی اور اس میں آپ کو ناکامی ہوئی (اور منطقی طور پر آپ کو ناکام ہونا ہی تھا) تو اب آپ بند گلی میں کھڑے ہیں، کارکن مایوس ہیں اور ان کی مایوسی بجا ہے اور آپ محض خود کو اور جماعت کو زندہ رکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

ان اسباب کی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ مولانا محترم کا دوسرا اجتہاد (مغرب کی الحادی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دینا) بھی صحیح ثابت نہیں ہوا۔ مولانا تو اپنے ربّ کے پاس پہنچ گئے۔ ہم دوسرے اہلِ علم و فضل سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور اس اجتہاد پر نظر ثانی فرمائیں۔

ان وضاحتوں کے بعد اب ہم جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب سے گزارش کرتے ہیں کہ:

❁ وہ اپنے اس موقف پر نظر ثانی فرمائیں کہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ تھا کہ انتخابی سیاست کے ذریعے مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کا توڑ کیا جا سکتا ہے یا اس کے ذریعے غلبۂ اسلام کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لادین اور سرمایہ دارانہ مغربی جمہوریت میں اسلام کے کچھ اصولوں کی پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دینے کی غلطی بھی ان کی سمجھ میں آ جانی چاہیے کیوں کہ اگر سوشلزم کے ساتھ اسلام کے کچھ معاشی اصولوں کی پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی سوشلزم' کہنا غلط ہے اور سرمایہ داری کے اصولوں میں چند اسلامی باتوں کی پیوندکاری کر کے اسے 'اسلامی سرمایہ داری' کہنا غلط ہے تو لادین مغربی جمہوریت میں کچھ اسلامی اصولوں کی پیوندکاری

کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' کہنا کیوں غلط نہیں؟ ہم حیران ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے معاشی نظام (سرمایہ داری) کی اتنی مذمت کرتے ہیں لیکن وہ اس کے سیاسی نظام (جمہوریت اور جمہوری انتخابات) کی مذمت نہیں کرتے؟

۞ پاکستان میں انتخابات تقریباً مغربی جمہوری اصولوں کے مطابق ہوتے ہیں اسی لیے ان کے ذریعے دینی سیاسی جماعتیں کامیاب نہیں ہوئیں اور نہیں ہوسکتیں اور نہ ان کے ذریعے اسلامی انقلاب لانا ممکن ہے۔

ہاں! چونکہ اسلام بھی شورائیت کا علم بردار ہے جس میں لوگوں سے مشورہ کرنا ضروری ہوتا ہے لہٰذا انتخابات کی ایسی شکلیں وضع کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے مطابق ہوں (ایسی ہی ایک تجویز البرہان کے موجودہ شمارے میں پیشِ خدمت ہے) لیکن جب اسلامی قوتوں نے مغربی جمہوریت اور اس کے نظام انتخابات کو قبول کر لیا تو اب کسی دوسرے نظام انتخاب کے بارے میں کوئی کیوں سوچے؟

ڈاکٹر صاحب محترم نے ہٹلر اور مولینی کی مثال دی ہے کہ انہوں نے انتخابات جیت کر اپنے ایجنڈے پر عمل کیا تو اسلامی جماعتیں یہ کیوں نہیں کرسکتیں؟ ہم کہتے ہیں کہ ان کا پیراڈائم ایک تھا۔ ہٹلر اور مسولینی مغربی فکر وتہذیب کو چیلنج کرنے نہیں اٹھے تھے لہٰذا انہوں نے جائز و ناجائز مختلف ہتھکنڈے استعمال کر کے انتخاب جیت لیا۔ کوئی دینی سیاسی جماعت ان ہتھکنڈوں کو استعمال نہیں کرسکتی جو پاکستان کی سیکولر سیاسی جماعتیں کرتی ہیں لہٰذا وہ کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ اور اگر ان ہتھکنڈوں میں سے کچھ سادہ چیزوں کو بھی وہ استعمال کریں تو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں اور اسے برا اور غیر اسلامی سمجھتے ہیں جیسے جماعت کے اکثر لوگوں نے قاضی حسین احمد مرحوم کی انتخاب جیتنے کی عوامی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی اور چونکہ عوام اسے اسلامی اقدار سے انحراف سمجھتے ہیں لہٰذا ووٹ وہ پھر بھی ان اسلامی جماعتوں کو نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی حسین احمد مرحوم کی 'لبرل' پالیسیوں کے باوجود لوگوں نے جماعت کو ووٹ نہیں دیے اور جماعت کو حسب سابق ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

۞ ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کو مسلکی دینی سیاسی جماعتوں سے اتحاد، اصلاحی تحریکوں سے حصول تائید اور مسجدوں کا وفاق بنا کر ان کی سپورٹ حاصل کر کے انتخابات جیتنے کی جو پالیسی تجویز کی ہے اس کا مولانا مودودیؒ کی فکر سے کوئی تعلق نہیں اور نہ مولانا نے کبھی اس قسم کی

کوئی تجویز اپنی زندگی میں کبھی دی۔

امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور جماعت کو انتخابی سیاست جاری رکھنے کی جس مہم پر وہ لگے ہوئے ہیں اس پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

ضمیمہ

'نظامِ اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب'

ازسید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۴۸ء)

....واضح طور سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کرلیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہوگیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہیں۔ (جنہیں ہم نے اپنے ''مطالبہ'' میں بیان کردیا ہے)، پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے، پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہوجائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کرسکیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور وارادہ کو بتدریج اس حد تک نشونما دیا

جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقہ کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہوگئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کردی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہوگا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں، اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کردیں گے، جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کررہے تھے۔

(اسلامی ریاست، ص: ۴۰۷ تا ۴۲۷، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، طبع ۱۹۶۷ء)

ظاہر

لاہور

سید مودودی نے یہ کیا کہہ دیا؟

۱۱ اپریل ۱۹۶۹ء

سید مودودی نے کیا فرما دیا ہے — یہ کیا کہہ دیا انہوں نے ہے — انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں، اور وضاحت اس کی یوں کی کہ جمہوریت میں اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جاسکتا ہے، اگر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنا لیا جائے، اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کی جائے، قید و بند کی صعوبتیں بھی درپیش ہوں تو راہِ مستقیم نہ چھوڑی جائے۔ آبادی کے بڑے حصے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر پھیلایا جائے۔ جب آبادی کی کثیر تعداد ہم خیال ہو جائے گی، تو حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جاسکے گا اور انہیں جھکنے پر مجبور کیا جاسکے گا۔ دلیل اس کی یوں دی کہ ماضی قریب میں ہندوستان سے انگریز کو بھگانے کے لیے اسے کسی انتخاب میں شکست نہیں دی گئی تھی، بلکہ رابطۂ عوام کے ذریعے ہی بھگایا گیا تھا۔

سید محترم کے ان خیالات کو بار بار پڑھیے اور پھر سوچیے، کیا کہہ دیا انہوں نے اس نتیجے پر پہنچیے، یہ چارہ نہیں رہے گا کہ جناب سید نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے واشگاف کیا ہے اور جھک جھک کر مایوس ہو جانے والوں یا چل چل کر تھک جانے والوں کو امید سے آگاہ کیا ہے، ذوقِ سفر سے ان کا تعارف کرا دیا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی
۵۔ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ
لاہور۔ (پاکستان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فون نمبر: ۸۲۵۰۰۴
حوالہ: ۱۸-۱۲۰
تاریخ: ۲۷۔۶۔۷۶ء

برادرم وصی مظہر صاحب۔   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ میرے متعلق آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۶۸ء سے مسلسل انحطاط نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ کوئی کام اپنی ذمہ داری پر ہاتھ میں لے کر چلا سکوں۔ آپریشن کے بعد مجھے ایک دن بھی آرام لینے کا موقع نہیں ملا۔ ۶۹ء اور ۷۰ء میں شدید محنت نے میری قوت کو گھُن لگا دیا ہے۔ ۷۱ء میں وجع المفاصل اور ۷۲ء میں وجع الفواد کے سخت حملے ہوئے اور آخر کار مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اب اس نظم اور تحریک کو چلانا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس وقت سے صحت کا بگاڑ پیہم بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس حالت میں اصلاح احوال محض میرے کچھ لکھ دینے اور کہہ دینے سے نہیں ہو سکتی۔ بس دعا کرتا ہوں کہ جو کام نیک نیتی کے ساتھ خدا کے دین کی بحالی کے لیے شروع کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو سیدھے راستے پر قائم کر دے اور جو لوگ جماعت کو چلانے والے ہیں ان کی رہنمائی فرمائے۔ میری زندگی اب آخری مراحل میں ہے۔ بہت جیا تو سال دو سال اور جی لونگا۔ آگے کام تو انہی لوگوں کو کرنا ہے۔ یہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے کہ جماعت کے لٹریچر میں وہ سب کچھ موجود ہے جس سے آگے کے مراحل میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کی ضرورت محسوس ہو۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودی
۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ
لاہور-۱۴ (پاکستان)

فون نمبر: ۲۵۰۰
حوالہ: 92
مورخہ: 29.5.72

محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ نے جن حالات کی طرف توجہ دلائی ہے ان کو میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ دور ایسے وقت آیا ہے جب میری قوتیں جواب دے چکی ہیں۔ لندن سے واپسی پر مجھے آرام لینے کا موقع نہ ملا اور حالات کی نزاکت کو دیکھ کر میں میدان جنگ میں کود گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتخابات کے بعد زمانے میں میں غیر متحرک رہا، حالانکہ وہ فیصلے کا وقت تھا۔ پھر انتخابات کے بعد ہی مجھے اوجع المفاصل کا حملہ ہوا اور کئی مہینے تک میں اس قابل بھی نہیں رہا کہ دماغ پر سوچنے کا بار ڈال سکوں۔ پھر جب کچھ افاقہ ہونے لگا اور میں نے اس پیچیدگی کو محسوس کیا جس میں جماعت اس وقت پڑ گئی ہے تو مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ میں خود شریک ہوا۔ لیکن اس سے فارغ ہوتے ہی دل کا دورہ پڑ گیا اور تجربے نے بتا دیا کہ میں اب اس بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اب اگر جماعت کو یکسو اور متحرک کرنے کے لیے اجتماع عام یا حلقوں کے اجتماع یا مجلس شوریٰ کے اجلاس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تو ان میں سے کوئی ایک تجویز رو بعمل لائی جا سکتی ہے۔ لیکن میں اب اس قابل نہیں رہا کہ اس طرح کے کسی اجتماع میں شریک ہو کر کوئی رہنمائی کر سکوں۔ مجھے تو میرے معالج نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو آئندہ کے لیے اس محنت سے سخت اجتناب کرو۔ اس حالت میں آپ اور جماعت کے دوسرے اہل الرائے اصحاب سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس طرح کام کرنے کی راہ نکالیں جس طرح اچانک میرے مرجانے کی صورت میں کرنا ہوتا۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

انتخابی جدوجہد اور غلبۂ دین	پروفیسر طارق بٹ

انتخابی جدوجہد سے پاکستان میں غلبۂ دین ممکن نہیں

دینی جماعتوں خصوصاً جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد میں کامیابی کے حوالے سے
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی خوش فہمیاں بے بنیاد ہیں

کراچی کے بزرگ دانشور محترم ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کے مضمون پر راقم نے جو تبصرہ البرہان (شمارہ جون ۲۰۱۷ء) میں کیا تھا، اس کا جو جواب انہوں نے دیا ہے وہ البرہان کے شمارہ اکتوبر میں نظرے گزرا۔ اس پر ہماری گزارشات درج ذیل ہیں:

سچی بات یہ ہے کہ ہمارے دل میں ڈاکٹر صاحب کا بہت احترام ہے اور ہم ان کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتے لیکن ان کی بعض باتیں اتنی کمزور اور ناپختہ ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ یہ ان کا موقف ہے مثلاً:

۱۔ وہ یوں ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے خود وہ جماعت اسلامی ہیں یا وہ اس کے ترجمان ہیں۔ حالانکہ نہ وہ جماعت کے رکن ہیں نہ عہدہ دار ہیں نہ وہ جماعت کے اندرونی حلقے کے آدمی ہیں اور نہ جماعت انہیں اپنا نمائندہ یا ترجمان سمجھتی ہے۔ پھر وہ یہ کیوں ظاہر کرتے ہیں کہ جو وہ کہہ رہے ہیں وہ جماعت کی رائے ہے؟ انہیں سیدھے سبھاؤ یہ کہنا چاہیے کہ جماعت کے لیے اور دینی جماعتوں کے لیے میری یہ تجاویز ہیں یا میری رائے میں جماعت کو انتخابی کامیابی کے لیے یہ اور یہ کام کرنے چاہئیں۔

پھر اپنے تازہ مضمون میں انہوں نے اپنی تحریر کے آخر میں 'فکر مودودی گروپ' لکھا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جماعت کے اندر یا اس کے باہر کوئی 'فکر مودودی گروپ' بنا رکھا ہے؟ اس گروپ کا صدر کون ہے، اس کی تنظیم کیا ہے؟ ہیڈ آفس کہاں ہے؟ اس میں کون معروف لوگ شامل ہیں؟ ان ساری باتوں کے بارے میں ہمیں اور پبلک کو کوئی خبر نہیں۔ کئی سال پہلے 'تحریک فکر مودودی' کے نام سے مرحوم نعیم صدیقی صاحب کی زیر صدارت ایک نئی جماعت بنی تھی۔ پھر اس کا نام ان لوگوں نے بدل کر 'تحریک اسلامی پاکستان' رکھ لیا اور نعیم صاحب بھی اسے چھوڑ گئے۔ یہ جماعت تھوڑے سے لوگوں پر مشتمل ہے اور اب بھی کام کر رہی ہے، 'نشور' کے

نام سے ایک پندرہ روزہ جریدہ بھی نکالتی ہے۔ اب پتہ نہیں کہ محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ 'فکر مودودی گروپ' کب بنایا اور کیسے بنایا؟ یہ جماعت کے اندر ہے یا باہر ہے؟ اور اس کا جماعت سے کیا تنظیمی یا فکری تعلق ہے؟

اور لطف کی بات یہ ہے کہ جو بات 'فکر مودودی' کا نعرہ لگا کر وہ کہہ رہے ہیں یعنی جماعت اسلامی دیگر مسلکی جماعتوں (یعنی دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اہل تشیع کی قائم کردہ دینی سیاسی جماعتوں) کے ساتھ مل کر اور اصلاحی دینی جماعتوں (جیسے تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی دینی مدارس اور صوفی حلقے) اور ملک بھر کی مختلف مسالک کی مساجد کا وفاق بنا کر ان کی تائید سے الیکشن لڑے، یہ بات مولانا مودودیؒ نے کبھی ساری زندگی نہیں کہی۔ یہ محترم ڈاکٹر انصاری صاحب کی ذاتی رائے ہے لیکن آپ اسے 'فکر مودودی' کہہ کر پیش کر رہے ہیں۔ ایں چہ بوالعجبی است! جدید اسلامی تحریکوں خصوصاً جماعت اسلامی کا مطالعہ راقم کی دلچسپی کا موضوع ہے۔ اگر مولانا مودودیؒ نے کبھی یہ بات کہی ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کا حوالہ دے کر راقم کے علم میں اضافہ فرمائیں اور اس پر احسان کریں۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب محترم اپنی خواہشوں، آرزوں اور زمینی و عملی حقائق میں فرق نہیں کرتے اور انہیں گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

وہ چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی انتخابات میں کامیاب ہو۔ جناب! ہم بھی یہی چاہتے ہیں اور صدق دل سے چاہتے ہیں لیکن ہماری اور ڈاکٹر صاحب کی خواہش و آرزو سے کیا ہو سکتا ہے؟ عملی اور زمینی حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی عوام کی حمایت کھو چکی ہے بلکہ اسے کبھی عوامی حمایت حاصل ہی نہیں ہوئی۔ مسلسل انتخابی شکستوں نے اسے نڈھال کر دیا ہے اور کارکنوں کو مایوس۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں جماعت کے مرکزی قائدین نے چند سو ووٹ لیے اور ان کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ ابھی چند ہفتے پہلے لاہور میں ضمنی انتخاب ہوا تو سوا کروڑ ووٹوں میں سے جماعت کے امیدوار نے ۵۹۲ ووٹ لیے۔ اس صورت حال میں جماعت کو یہ مشورہ دینا کہ انتخابات لڑ کر اسلامی انقلاب برپا کر دو اور سرمایہ دارانہ نظام کے در و دیوار ہلا دو، یہ فرزانگی نہیں دیوانگی ہے جس کی ہم حمایت نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے صحیح اور متوازن رویہ یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کے قائدین کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ فکرمندی سے سر جوڑ کر بیٹھیں، شکستوں کے اسباب پر غور کریں اور صورت حال کی اصلاح کے لیے کوئی متبادل لائحہ عمل تیار کر کے اس پر عمل

کریں۔ مثلاً یہ کہ اسلام کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی خاطر سیاسی انتخابی دوڑ میں شامل رہنے کی بجائے جماعت دعوت دین اور اصلاح فرد و معاشرہ کی طرف لوٹ جائے جب تک کہ زمین ہموار نہ ہو جائے اور لوگ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے اس کے ہم خیال اور اس کے حمایتی نہ بن جائیں۔ بلکہ خود ڈاکٹر صاحب ان مسلسل شکستوں کے اسباب کا تجزیہ کر کے ایک اصلاحی پیکیج تیار کر کے جماعت کو دیں تا کہ اہل جماعت اس پر غور و فکر کر کے اس کے مفید اور قابل عمل پہلوؤں پر عمل کریں۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ساری دینی سیاسی جماعتیں مل کر الیکشن لڑیں۔ ان کی طرح ہماری بھی یہی خواہش ہے لیکن ہماری اور ڈاکٹر صاحب کی خواہش سے کیا ہوتا ہے؟ ہماری اور ان کی خواہشوں اور بہت سے لوگوں کی کوششوں کے باوجود پاکستان کی ہر دینی سیاسی جماعت کسی نہ کسی مسلک پر مبنی ہے اور وہ اس کے تعصب سے باہر آنے پر تیار نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کوئی مسلکی جماعت کبھی برسر اقتدار نہیں آ سکتی کیونکہ دوسرے مسالک کے ووٹر انہیں کبھی ووٹ نہیں دیں گے لیکن اس کے باوجود ہر مسلک کے لیڈر نے اپنی سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے بلکہ ایک مسلک کی کئی سیاسی جماعتیں اور دھڑے ہیں۔ انتخابی سیاست میں یہ جماعتیں ماضی میں کبھی اکٹھی نہیں ہوئیں، سوائے ایک آدھ استثنٰی کے، اور زمینی حقیقت یہ ہے کہ یہ اب بھی اکٹھی نہیں ہیں اور نہ کبھی آئندہ ہوں گی کیونکہ جہاں اخلاص اور فراست نہ ہو وہاں اتحاد ممکن نہیں ہوتا۔ ان جماعتوں کے مسلکی تعصب، ان کی فرقہ واریت اور ان کے باہمی انتشار کا انکار ایسے ہی ہے جیسے سورج کے روشن ہونے کا انکار کر دیا جائے۔

مولانا فضل الرحمن صاحب کے بارے میں ہم نے جو کہا تھا وہ بہتان نہیں زمینی حقائق ہیں۔ جن لوگوں کا عملی سیاست سے کوئی واسطہ ہے وہ ان باتوں کو جانتے ہیں۔ خود جماعت اسلامی کے حلقے کی بھی یہی رائے ہے۔ قاضی حسین احمد زندہ ہوتے تو وہ آپ کو بتاتے کہ ایم ایم اے کیوں ٹوٹی؟ سید منور حسن، سابق امیر جماعت اسلامی، کراچی میں ہوتے ہیں، کبھی ان کے پاس جائیے اور جا کر حقائق پوچھئے تو آپ کی خوش فہمیوں کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ ایم ایم اے کو لوگ 'ملا ملٹری الائنس' ایسے ہی نہیں کہتے ۔ یہ امر معروف ہے کہ مولانا فضل الرحمن اسٹیبلشمنٹ کے آدمی ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی پیپلز پارٹی کی حکومت ہو، فوج کی

حکومت ہو، مسلم لیگ کی حکومت ہو وہ ہر جگہ وزارتیں لینے میں کامیاب ہو جائے؟ یہ جادوگری نہیں ابن الوقتی، بے اصولی اور مفاد کی سیاست کی انتہا ہے۔ ابھی چند ماہ پیشتر لاہور میں ساری دینی جماعتیں ممتاز قادری کی شہادت اور حقوق نسواں بل پر تحریک چلانے پر آمادہ ہو گئی تھیں لیکن حکومتی ایما پر مولانا نے تحریک چلنے سے پہلے ہی جس طرح آکر ان کوششوں کو سبوتاژ کیا، ہم اس کے عینی شاہد ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب محترم کتابی آدمی ہیں اور یہ تلخ سیاسی حقائق شاید ان کے علم میں نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ایک ہے یہ خواہش کہ دینی سیاسی جماعتیں پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے اور مغربی تہذیب کے رد کے لیے متحد ہو جائیں یہ خواہش بڑی نیک ہے لیکن دوسری طرف عملی اور زمینی حقائق یہ ہیں کہ یہ دینی سیاسی جماعتیں اس مقصد سے نہ کبھی ماضی میں اکٹھی ہوئی ہیں، نہ آج اکٹھی ہیں اور نہ آئندہ کبھی ہوں گی کیونکہ جہاں اخلاص اور فراست دونوں نہ ہوں وہاں اس قسم کا اتحاد ہو نہیں سکتا۔ ہاں! مولانا فضل الرحمن کو ذاتی یا جماعتی سیاسی فائدہ نظر آیا تو ممکن ہے وہ دوسری دینی سیاسی جماعتوں سے اتحاد کر لیں جیسا کہ وہ دوسری سیکولر جماعتوں سے ماضی میں اتحاد کرتے رہے ہیں اور آج کل بھی کیے ہوئے ہیں۔

۴۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش بھی بہت نیک ہے کہ تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی جیسی اصلاحی تحریکیں دینی سیاسی جماعتوں کی فعال حمایت کریں اور انہیں کامیاب کرائیں۔ دینی مدارس اور صوفی حلقے بھی ان کی تائید میں کھڑے ہو جائیں۔ خواہش کی حد تک یہ تصور بہت خوش کن ہے لیکن کیا زمینی حقائق کی رو سے اس کا عملاً کوئی امکان بھی ہے؟ جب ان اصلاحی تحریکوں کا تصور دین یہ ہے کہ وہ سیاسی جدوجہد کو دین کا کام ہی نہیں سمجھتیں تو وہ اس کی حمایت کیوں کریں گی؟ جب دینی مدارس دنیاوی اور عصری علوم کی تعلیم دینے کو تیار نہیں تاکہ وہ ریاست کو کارکن مہیا کریں اور اسے اسلامی ریاست بنائیں اور نہ وہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت سے ہٹنے کو تیار ہیں تو ان سے یہ توقع عملاً کیسے کی جائے کہ وہ جماعت اسلامی کو ووٹ دیں گے یا کسی دوسرے مسلک کی دینی سیاسی جماعت کو کامیاب کرائیں گے؟

اسی طرح کون نہیں جانتا کہ ہماری مساجد مسلک پرستی اور فرقہ واریت کا گڑھ ہیں۔ ہماری اور ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ یہ اللہ کے گھر بن جائیں جہاں سارے مسلمان بلا

تفریق مسلک جمع ہوں اور یہ جہالت و افلاس کے خاتمے اور عدل و امن و امان کے قیام میں فعال کردار ادا کریں۔ یہ ایک نیک خواہش ہے اور ہم اس کی تائید کرتے ہیں لیکن کیا عملاً یہ ممکن ہے؟ کیا دینی مسالک یہ ہونے دیں گے؟ اور کون سی جماعت ہے جو یہ کام کرے گی؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی کو اور دوسری سیاسی و اصلاحی دینی جماعتوں کو پہلے مذکورہ بالا سبق پڑھائیں، انہیں اس پر عمل کرنے پر آمادہ کریں۔ متحدہ علماء کونسل، ملی مجلس شرعی اور ملی یکجہتی کونسل برسوں سے علماء اور دینی جماعتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور انہیں کوئی ٹھوس کامیابی نہیں ملی تو ڈاکٹر صاحب کے چند مضمون لکھ دینے سے یہ کام نہیں ہو جائیں گے۔ اور نہ وہ نتائج نکل سکیں گے جن کا خواب ڈاکٹر صاحب دیکھ رہے ہیں۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 500 روپے　　　تاحیات 5000 روپے

نام..

پتہ..

فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنٰی ہیں

انتخابی جدوجہد اور غلبۂ دین

چوہدری رحمت علی[1]

موجودہ انتخابی ڈھانچہ غیر اسلامی ہے

انتخابی عمل کا ایک صحیح اسلامی مجوزہ خاکہ

آج کل وطن عزیز میں انتخابات کی پھر آمد آمد ہے۔ گو اس بات کا کہ کیا واقعی انتخابات ہوں گے دارومدار اس پٹیشن پر ہے جس کی سماعت ان دنوں سپریم کورٹ میں ہو رہی ہے۔ ایک انوکھی بلکہ انہونی بات جس کا تذکرہ ان دنوں دینی حلقوں اور علماء کرام کی طرف سے سننے میں آرہا ہے یہ ہے کہ تمام کاتب فکر کے علماء کرام جو دینی سیاسی جدوجہد کے ذریعہ غلبۂ دین چاہتے ہیں یا اپنی علمی سرگرمیوں کے ساتھ نفاذِ شریعت کا درد رکھتے ہیں، اپنے سابقہ سیاسی طرزِ عمل پر نظر ثانی کرتے ہوئے اور دو بڑے سیاسی دھڑوں میں سے کسی ایک کا ضمیمہ بننے کی بجائے اپنی دینی سیاسی قوت کا جداگانہ تشخص قائم کریں۔ ہمارے نزدیک یہ سوچ انوکھی تو اس لیے ہے کہ تقریباً چھیالیس سال ضائع کر کے اور ملک کا ایک حصہ کھو کر آخر آج یہ کیسے انکشاف ہوا کہ اسلام میں کوئی ''اتحاد'' اور ''بَعْضُهُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْض جیسی کوئی چیز بھی ہے۔ یہ بات انہونی اس لیے ہے کہ وہ طرزِ انتخابات جو ہمارے یہاں رائج ہے اور جسے بد قسمتی سے ہمارے آئین کی پشت پناہی حاصل ہے، اپنی اٹھان اور فطرت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ ایک تو وہ صرف سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو ہی آگے لانے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اگر دو چار دس افراد اس طریق انتخابات کے ذریعہ اپنے ذاتی کردار کی بنا پر چنے جائیں تو معجزہ سے کم نہیں۔ دوسرے یہ طریق انتخابات اتحاد، محاذ، الائنس وغیرہ کے تصور ہی کی نفی کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسا محاذ بنایا جائے تو اوّل تو انتخابات سے پہلے ہی اپنی حقیقت کھو دیتا ہے یا بعد میں اس طرح بے وقعت قرار پاتا ہے جس طرح خالی پیٹ کو نین باہر نکال پھینکتا ہے۔ صرف پاکستان میں ہی نہیں دنیا کے ہر ملک میں جہاں بھی اسے اپنایا گیا ہے، ایسا ہی ہوا ہے۔ پاکستان کے لیے اور خصوصاً دینی حلقوں کے لیے تو یہ طریق انتخابات اس لیے ناقابل قبول ہونا چاہیے کہ یہ غیر شرعی ہے۔ اسے [illegible] کی روشنی میں بنایا ہی نہیں گیا۔ یہ غیر مسلم ایوانوں کا وضع کردہ ہے۔ ہماری سہل نگاری اور بے توفیقی کہ ہم مسلمانوں نے اسے جوں کا توں اپنا رکھا ہے۔ ''خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں'' کے مصداق اسے مسلمان

---

[1] مدیر ماہنامہ 'سبق پھر پڑھ'، لاہور

کیے بغیر اختیار کر کے ہم اللہ ورسول ﷺ کی صریح نافرمانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جو لوگ اس طرزِ انتخابات کو اپنائے ہوئے ہیں وہ یقیناً دین کی کوئی خدمت کرنے کی بجائے بے دینی کر رہے ہیں لہٰذا انہیں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تائب ہو کر اس میں حصہ لینے سے پہلے اسے قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ اس مختصر مضمون میں کتاب وسنت کی ان درجنوں تعلیمات کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں جن کی یہ طریق انتخابات نفی کرتا ہے البتہ بطورِ مثال چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں بیان کردہ فرمودات واحکام تمام قطعی ہیں لیکن زیر بحث فرمان ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دیا ہی حاکمانہ انداز والفاظ میں ہے۔ فرمایا:

''مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں (امانت دارانہ مناصب) اہل امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔'' [النساء ۴:۵۸]

یوں امانت دارانہ مناصب اہل لوگوں کے سپرد کرنے کی تاکید کے بعد اللہ نے اہلیت کے بارے میں بھی ہمیں اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ پانچ صفات یعنی ① ایمان (النور: ۵۵) ② تقویٰ (الحجرات: ۱۳) ③ صلاح (النور: ۵۵) ④ علم ⑤ اور جسم (البقرہ ۲۴۷) پر مشتمل قرآنی معیارِ اہلیت دیا ہے۔ افسوس کہ آئین پاکستان چند مبہم اہلیتوں کا ذکر تو کرتا ہے لیکن قرآنی معیارِ اہلیت کو نظر انداز کرتا ہے۔ نتیجے کے طور پر مروجہ انتخابات کے ذریعہ جو لوگ نمائندہ بن کر سامنے آتے ہیں ان کی عظیم اکثریت قرآن کریم کے اس دیئے ہوئے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ ہم نااہل لوگوں کو امانت دارانہ عہدے سونپ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی صریحاً نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قرآنی معیارِ اہلیت کے مذکورہ پانچ اوصاف میں سے تین یعنی ایمان، تقویٰ اور صلاح تو ایسے ہیں کہ کسی فرد کی گزشتہ زندگی کے پورے ریکارڈ کو کھنگالنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اہل ہے کہ نااہل لیکن دو صفات یعنی علم اور جسم تو ایسی ہیں جو فوراً بتا دیتی ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ علم سے مراد ظاہر ہے قرآن وسنت کا علم تو ہے ہی تاہم علمیت کی شرط پوری کرنے کے لیے اس کے علاوہ جہاں بانی وجہاں بینی بھی درکار ہے۔ امانت دارانہ عہدوں کو پُر کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک طرف قرآن وسنت کی تعلیمات پر خاصا عبور رکھتے ہوں تو دوسری طرف جہاں دیدہ بھی ہوں لیکن ہمارا آئین میں دیا ہوا طریق انتخاب ایسے لوگوں کو قومی اسمبلی میں پہنچا دیتا ہے جن کی اکثریت قرآن وسنت کی تعلیمات سے قطعی نابلد ہوتی ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی نظریاتی کونسل جیسا ادارہ علیحدہ بنا کر خواہ مخواہ اس کا اضافی بوجھ قومی خزانہ پر

ڈالنا پڑتا ہے۔ حالانکہ قومی اسمبلی کی حیثیت اسلامی شوریٰ کی ہے جس کا بنیادی کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف معاملات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لے کر سربراہِ حکومت کو مشورہ دے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ایک لیکچرار کو تو بغیر مناسب اہلیت کے عہدہ دے دیا جائے اور پھر اس اہلیت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک علیحدہ بورڈ قائم کر دیا جائے تاکہ لیکچرار کی مدد کا بندوبست ہو جائے۔

وائے ناکامی، امانت دارانہ عہدوں کے لیے قرآنی معیارِ اہلیت کی اس ایک صفت یعنی علم کو ہم اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے جتنی کہ چھوٹے سے چھوٹے عہدے مثال کے طور پر فیلڈ اسسٹنٹ یا نرس کے عہدے کے لیے دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مثلاً پنجاب اسمبلی کے ۲۸۰ ارکان میں سے ۱۳۰ ان پڑھ اور ایک اچھی خاصی تعداد ایسے ارکان کی ہے جن کی تعلیم مڈل تک ہے۔

جہاں تک جسمانی اہلیت کا تعلق ہے تو اس بارے میں تو ہم مزید بے نیاز ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارا آئین ساٹھ سال کی عمر کے ملازمین کو تو ریٹائر کر دیتا ہے لیکن ریٹائرڈ ملازم کو ۲۲ سال بعد تک صدر گوارا کر لیتا ہے خواہ وہ قبر میں ہی ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہو۔ کتنا مذاق اڑا رہے ہیں ہم قرآنی تعلیمات کا! حیرت تو یہ ہے کہ وہ جو دینی سیاست کے علمبردار ہیں وہ تک دم دبا کر اسی طریق سیاست اور طریق انتخابات میں شامل ہیں جو قرآن کی صریحاً خلاف ورزی کا مظہر ہے۔ کیا اللہ ہم سے پوچھے گا نہیں کہ تم اتنے بے توفیق کیوں ہو گئے تھے کہ اغیار سے لیے ہوئے طریق انتخابات کو اپنی اقدار کے مطابق ڈھال بھی نہ سکے؟ دین کے علمبرداروں کی کم کوشی، غفلت اور کوتاہ بینی کی وجہ سے ہمارا رُخ ہی جب کعبے کو نہیں تو بتائیے وہ نتائج کیسے پیدا ہوں جو قرآن وسنت پر عمل پیرا ہونے سے ہونے چاہئیں؟

اسلامی سیاست کا دوسرا بڑا اصول یہ ہے کہ کوئی شخص خود امیدوار کھڑا ہو کر لوگوں سے ووٹ نہیں مانگ سکتا جب کہ مروجہ طریق انتخابات کا مرکز ومحور ہی امیدوار کھڑا ہو کر اپنے حق میں انتخابی مہم چلانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اللہ کی قسم ہم عہدہ اس شخص کو نہیں دیتے جو اس کی مانگ کرے اور اس کی حرص کرے۔''
[صحیح مسلم]

ہم نے قرآن وسنت کی برکات وفیوض تک سے اعراض کیا ورنہ غور کریں تو اس ایک اسلامی تعلیم کو پس پشت ڈال کر پوری انسانیت نے اپنے آپ کو جہنم میں جھونک رکھا ہے۔ اس وقت دنیا میں جس قدر استحصال، شر، فساد، بدامنی، بے چینی، بے انصافی، سفارش، رشوت، اقرباء پروری وغیرہ ہے اس کا بنیادی سرچشمہ ایک فرد کا دوسرے کے ووٹ کا محتاج ہوتا ہے۔ بڑی بڑی آفتیں،

سیلاب، ایٹم بم کا استعمال وغیرہ انسانیت کے لیے اتنے مہلک ثابت نہیں ہوئے جتنا مہلک کہ مروجہ ووٹنگ سسٹم ہے۔ اگر مروجہ ووٹ نہ ہوتا تو یقین جانیے غریب غریب تر اور امیر امیر تر نہ ہوتا۔ اگر مروجہ ووٹ نہ ہوتا تو کچھ خاندان، جیسے کہ پیدائشی حاکم ہوں، نہ ہوتے۔ جدی دشمنیاں اور ہارس ٹریڈ ینگ جیسی مکروہ روایات عنقا ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام عوامی نمائندوں کو ووٹ جیسی کسی شے کا محتاج نہیں بناتا۔

یاد رہے کہ انتخابات کے حوالہ سے ایک محاورہ یعنی ''آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ'' سن سن کر ہمارے کان پک گئے ہیں۔ لیکن مروجہ ووٹنگ کا مرحلہ سر ہو جاتا ہے تو پھر اور طرح کی بولیاں بمثل ''دھاندلی، جھرلو، بوگس اسمبلیاں وغیرہ'' ہمارے سیاستدانوں کا معمول بن جاتی ہیں۔ بھرتی پر سے پابندی اٹھاتے ہوئے قوم کو ''میرٹ کی بنیاد پر'' کی نوید سنائی جاتی ہے لیکن جب حکومت بدلتی ہے تو دوسری حکومت ان ملازمین کی فہرست بنانا شروع کر دیتی ہے جو میرٹ تو درکنار ایسے عہدوں پر قابض ہوتے ہیں جن کے لیے مطلوبہ اہلیت ومعیار تک کو وہ پورا نہیں کرتے۔ یاد رہے جب تک اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر ہم عوامی نمائندوں کو مروجہ ووٹ کا محتاج رکھیں گے ہمارے ہاں ہمیشہ قرآنی معیارِ اہلیت کی بجائے جاگیردار، سرمادار اور رسہ گیر وغیرہ حکومت کے ایوانوں پر قابض رہیں گے۔ میرٹ پر کبھی بھرتی نہیں ہوگی، سفارش کا چلن رہے گا، رشوت سے ہی لوگوں کے کام ہوں گے اور عدل وانصاف کا جنازہ نکلتا ہی رہے گا۔

مروجہ طریق انتخاب میں اور بھی بہت سے پہلو ہیں جو کتاب وسنت کے خلاف ہیں لیکن ہم طوالت سے بچتے ہوئے دینی سیاسی رہنماؤں، علماء کرام اور بہی خواہانِ ملت سے پوچھتے ہیں کہ سیکولر عناصر، جاگیردار اور سرمایہ دار تو اس نظام انتخاب کو کبھی بدلنے کی نہیں سوچیں گے جو ان کے آقا جاتے ہوئے ان کے ہاتھ تھما گئے اور جس میں ہی ان کے مفادات پنہاں ہیں بلکہ آخری دم تک وہ اس طریق انتخابات کے محافظ اور پشتیبان بن کر کھڑے ہوں گے لیکن آپ حضرات جو بصورتِ دیگر تو بہت فلسفے جھاڑتے اور طرح دار دانش ورانہ تقریریں کرتے ہیں آخر کیوں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں؟ کیا آپ کوئی ایسا طریقی انتخاب وضع نہیں کر سکتے جو کتاب وسنت کے تمام احکام پر عمل پیرا ہونے کے قابل بھی بنائے اور حکومت کی باگ ڈور بھی ایسے ہاتھوں میں تھمائے جو صالح اور اہل ہوں۔ گنجائش ہی نہ رہے کہ کوئی دولت، دھاندلی، دھونس اور دھوکے کا سہارا لے کر حکومت پر قابض ہو جائے۔ ایسا طریق انتخابات وضع کرنا سو فیصد ممکن ہے لیکن ہماری بدقسمتی ہم

نے ایسا کرنے کا کبھی سوچا ہی نہیں۔ اتنے بے توفیق ہو گئے ہم کہ سفید چمڑی والے کے دیئے ہوئے نظامِ انتخابات کو آنکھیں بند کر کے اپنائے جا رہے ہیں۔

مجوزہ اسلامی طریق انتخاب

ذیل میں ہم ایک ایسے ہی طریقۂ انتخاب کی نشاندہی کرتے ہیں، گو یہ طریق انتخاب حرفِ آخر نہیں، اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے جب معیاری لوگ آگے لانے ہوں تو جو ادارہ معیاری لوگوں کی نشاندہی کرے ایک ہی ہونا چاہیے۔ پورے ملک کی سطح پر ایسا واحد ادارہ ایسا الیکشن کمیشن ہی ہو سکتا ہے۔ جس کے کار پرداز ان قابل اعتماد اسلامی اور اخلاقی کردار کے حامل ہوں۔ اس الیکشن کمیشن کے حسب ضرورت یا مثال کے طور پر گیارہ پینل بنا لیے جائیں جن میں سے ایک نگران پینل ہو۔ دوسری طرف پورے ملک کو مناسب حلقوں، مثال کے طور پر قومی اسمبلی کے موجودہ حلقوں میں، تقسیم کر لیا جائے۔ ہر حلقہ میں الیکشن کمیشن کا ایک پینل سات دن مختلف ریسٹ ہاؤسوں، یونین کونسل کے دفتروں یا دوسری مناسب جگہوں پر قیام کرے جس کا اعلان پہلے سے اخبارات واشتہارات کے ذریعے سے کیا گیا ہو۔ ہر پینل اپنے اس قیام کے دوران متعلقہ لوگوں سے رابطہ کر کے ایسے افراد کی فہرست تیار کرے جو قرآنی معیارِ اہلیت پر پورے اترتے ہوں۔ فہرست کی کانٹ چھانٹ کر کے میرٹ کی بنا پر بالآخر پانچ افراد کی فہرست تیار کر لی جائے لیکن چنے گئے افراد، جن میں ظاہر ہے انیس بیس کا ہی فرق ہو گا، کے ناموں کو خفیہ رکھا جائے۔ اس طرح سے سات دن میں دس پینل دس حلقوں کا سروے مکمل کر لیں گے۔ اسی حساب سے کم وبیش ۲۵۰ حلقوں کا سروے تقریباً ۲۵ ہفتوں یا چھ ماہ میں مکمل ہو جائے گا۔ سروے مکمل ہوتے ہی الیکشن کمیشن انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرے۔ اعلان اور تاریخ انتخابات میں زیادہ سے زیادہ ۱۵ دن کا وقفہ ہو۔ ساتھ ہی ہر حلقے میں سے لیے گئے افراد کے ناموں کا اعلان بھی کر دیا جائے تا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اگر کوئی لیے گئے افراد کے علاوہ کسی اور بہتر آدمی کی نشاندہی کرے تو الیکشن کمیشن کا نگران پینل ایسی اپیلوں کی سماعت کر کے فیصلہ کر سکے۔ اس پندرہ دنوں کے وقفہ کے دوران اگر لیے گئے آدمیوں میں سے کوئی کنویسنگ کرے تو تقویٰ کے خلاف اُس کے اِس عمل کی وجہ سے اُس کا نام چنے گئے افراد کی فہرست سے خارج کر کے اس کی جگہ فہرست سے اگلا آدمی لے لیا جائے۔

انتخابات میں ہر حلقہ کے لوگ لیے گئے پانچ افراد میں سے اپنی مرضی کے تین افراد کی نشاندہی کریں۔ اس طرح جو آدمی سب سے زیادہ ووٹ لے اسے قومی اسمبلی یا مرکزی شوریٰ کا

رکن ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ جو افراد دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہوں وہ صوبائی اسمبلی کے ارکان گردانے جائیں۔ سربراہ حکومت/مملکت (یادرہے کہ اسلامی روایت میں سربراہِ حکومت اور سربراہِ مملکت علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے) کا چناؤ مرکزی شوریٰ کے ارکان میں سے ہو۔ مرکزی شوریٰ کا ہر رکن اپنی مرضی کے دوسرے رکن کی نشان دہی بذریعہ خفیہ ووٹنگ کرے۔ اسی طرح صوبائی ارکان شوریٰ بھی مرکزی شوریٰ کے من پسند رکن کی نشاندہی کریں۔ جو رکن سب سے زیادہ ووٹ لے وہی سربراہِ مملکت ٹھہرے۔ وزراء کا انتخاب سربراہِ مملکت کی صوابدید پر ہو۔ ملکی سطح پر ایسے انتخابات صرف ایک ہی دفعہ ہوں۔ سربراہِ مملکت یا کسی رکن شوریٰ کی سیٹ صرف تین صورتوں میں خالی متصور ہو: ایک تو وفات پا جانے کی صورت میں، دوسرے اگر متعلقہ عہدے دار خود معذرت کرے اور تیسرے اگر متعلقہ فرد میں قرآنی معیارِ اہلیت کے اوصاف میں سے کسی ایک میں کمی آ جائے۔ سربراہِ مملکت کے چناؤ کی جب بھی دوبارہ ضرورت پیش آئے تو چند گھنٹوں میں مرکزی اور صوبائی ارکانِ شوریٰ مذکورہ طریقے سے انتخاب کرلیں۔ دوبارہ اگر ووٹنگ ہوگی تو اس حلقہ میں جس کا رکن شوریٰ سربراہِ مملکت ہو جائے یا کسی دوسری وجہ سے رکن شوریٰ کی سیٹ خالی ہو جائے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے طریق انتخاب کو موجودہ صورتِ حال میں کیسے اختیار کیا جائے؟ ہمارے نزدیک حاملین محراب و منبر کے لیے یہ قطعاً مشکل نہیں۔ ہماری مختصر تاریخ میں دو مواقع ایسے آئے جن سے استفادہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک تو جب ایوب خاں کے خلاف تحریک چلی اور دوسرے جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ آج بھی اسی طریق پر کام ہوگا یعنی یہ تبھی ممکن ہے کہ دینی سیاسی جماعتیں اور دیگر تمام دینی حلقے موجودہ طریق انتخابات کا اس لیے مکمل مقاطعہ کریں کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ پھر احتجاجی تحریک سے مذکورہ طریق انتخاب کو اس ملک کا مقدر بنا دیں۔ دینی حلقے اگر یوں اپنے جداگانہ تشخص کا استعمال کریں گے تو وہ سالوں میں نہیں، مہینوں میں اس ملک کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں پائیں گے جو قرآنی معیارِ اہلیت پر پورے اترتے ہوں گے۔ یاد رہے صالح اور اہل ہاتھوں میں اقتدار ہونے کا مطلب ہی ''اسلامی نظام کا نفاذ'' ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر ہم قرآن و سنت کے مخالف موجودہ نظام انتخابات سے ہی وابستہ رہے تو اقتدار ہمیشہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور لٹیروں کے ہاتھوں میں رہے گا۔ گنتی کی چند سیٹیں اگر دینی حلقے حاصل کر بھی لیا کریں گے تو ان کی کیا اہمیت؟

آخر میں شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجوزہ طریق انتخاب میں کسی کو امیدوار بن کر ووٹروں کے پاس جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ محض کسی کی اہلیت اسے آگے لائے گی۔ (بشکریہ: ماہنامہ 'سبق پھر پڑھ')

انتخابی جدوجہد اور غلبۂ دین		مدیر

جماعت اسلامی کی خدمت میں

ایک مخلصانہ اور ہمدردانہ تجویز

لاہور کے حالیہ ضمنی الیکشن میں جماعت کے امیدوار نے سوا کروڑ ووٹوں میں سے ۵۹۲ ووٹ لیے اس سے جماعت کے بہی خواہوں میں یہ بحث پھر سے تازہ ہوگئی ہے کہ جماعت کو انتخابی سیاست جاری رکھنی چاہیے یا اس کے متبادلات پر غور کرنا چاہیے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کوئی سیاسی جماعت نہیں بلکہ اقامت دین کی تحریک تھی جس کا ماٹو یہ تھا کہ 'قرآن وسنت کی دعوت لے کر اٹھو اور دنیا پر چھا جاؤ' کیونکہ غیر صالح قیادت کو بدلنے کے لیے یہ ناگزیر تھا اور ہے کہ یہ کام عوام کی حمایت سے کیا جائے جس کے لیے دعوت واصلاح کے ذریعے فرد اور معاشرے کی اصلاح ناگزیر تھی تاکہ اسے اپنا ہم خیال بنایا جا سکے۔ یہی بات زور دے کر مولانا نے اپنی اس تقریر میں کہی تھی جو انہوں نے علی گڑھ میں کی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا نے مسلم لیگی حکمرانوں کے وعدوں اور عوام میں اسلامی جوش وخروش کی وجہ سے نفاذ اسلام بذریعہ سیاسی جدوجہد کا فیصلہ کیا تاہم اسی تحریر میں مولانا نے لکھا کہ یہ ایک تجربہ ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ کامیاب ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ نہ ہوا تو ہم اپنے پہلے موقف کی طرف لوٹ جائیں گے کہ پہلے دعوت واصلاح سے معاشرے کو اپنا ہم نوا بنایا جائے اور پھر غیر صالح قیادت کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

مولانا مودودیؒ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جماعت کی ناکامی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ فی الحال انتخابی سیاست سے غیر صالح قیادت کو بدلنا مشکل ہے لہٰذا ہمیں دعوت دین اور اصلاح فرد ومعاشرہ کی پہلی پالیسی کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ جماعت کی اس وقت کی قیادت نے یہ تجویز قبول نہ کی لیکن اب اس کے بعد جماعت نے انتخابات میں حصہ لینے کے متعدد تجربات کیے ہیں اور ہر دفعہ یہی نتیجہ نکلا ہے کہ جماعت کو عوام کی حمایت حاصل نہیں۔ لہٰذا اب مزید خرابی سے بچنے اور کارکنوں کو مزید مایوسی سے بچانے کے لیے جماعت کی قیادت کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ کم از کم اگلے دس پندرہ سال تک دعوت واصلاح کا کام کیا جائے اور عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی جدوجہد

کی جائے۔اس کے بعد دوبارہ انتخابی سیاست میں آنے کے بارے میں سوچا جائے۔ یا جماعت دعوت واصلاح کا کام کرے اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے اپنی الگ سیاسی جماعت بنالے جس طرح تحریک اسلامی نے مصر، فلسطین اور انڈونیشیا وغیرہ میں کیا ہے۔ اور یہ جماعت بھی فوری طور پر انتخابات میں حصہ نہ لے۔لیکن چونکہ حکمت عملی کی یہ تبدیلی ایک بڑا فیصلہ ہے اور جماعت میں اس وقت مولانا مودودیؒ جیسی کوئی بھاری بھر شخصیت بھی موجود نہیں لہٰذا بہتر ہوگا کہ قیادت یہ تجاویز ارکان کے سامنے رکھ کر ریفرنڈم کروالے اوران کے فیصلے پر عمل کرے۔

ہم نے جماعت کے ایک بہی خواہ اور ہمدرد کی حیثیت سے اور الدین النصیحہ اور تواصی بالحق کے فرمانِ الٰہی کے تحت یہ تجویز پیش کی ہے اور توقع رکھتے ہیں کہ جماعت کی قیادت اس پر غور کرے گی۔وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین.

بقیہ: اسلامی انقلاب کیسے آسکتا ہے؟

شرطیں دو ہیں: پہلی یہ کہ غلو ومبالغہ کیا جائے نہ کسی کی تردید یا تنقیص جیسے فضول ومہلک کام میں مبتلا ہوا جائے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جامع الصفات تھے۔آپ نے یہ تمام کام اکیلے کیے۔ہم میں سے اگر تمام کام کل وقتی نہیں کرسکتا تو اس کا جز وقتی تعاون اور دعائے خیر بھی ان شاء اللہ کل وقتی جامع محنت کا مِن وجہ قائم مقام ہوسکتی ہے۔دوسری شرط یہ ہے کہ ان انقلابی اور تحریکی شعبوں سے جڑنے والے ادارے یا افراد ''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' کے فرض کو نہ بھولیں۔یعنی ایک دوسرے کی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے رہیں اور اپنی اصلاح کے لیے بھی ہر وقت تیار وآمادہ رہیں، نیز توجہ دلانے کے بعد اثر نہ دیکھیں تو جب تک خیر غالب ہے صبر کریں اور تصابر کا مظاہرہ کریں۔اپنے طور پر حق کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور دوسروں کے لیے حتی الامکان صبر ودرگزر سے کام لیں۔

ان شاء اللہ العزیز جب اللہ کا امر آئے گا تو ان سب کا حصہ ہوگا جو مشکل وقت میں بھی ''مردِ مومن'' بن کرامت پر آئی اپنے سینے پر لے لیتے تھے اور اس کے عوض ستائش کی پروا کرتے تھے اور نہ صلے کی تمنا رکھتے تھے۔

اسلام اور پاکستان

مفتی ابولبابہ شاہ منصور[1]

اسلامی انقلاب کیسے آسکتا ہے؟

آج کا نوجوان طبقہ دو قسم کا ہے: ایک وہ جسے، اپنے ذاتی مستقبل اور اپنی ناآسودہ تمناؤں کی تکمیل کے علاوہ دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔ اس کی بلا سے دنیا اور دنیا میں بسنے والے مسلمان، جن کا وہ خود بھی ایک حصہ ہے اور جن کے وجود سے اس کا وجود وابستہ ہے، خواہ بھاڑ میں جائیں اسے ان سے کوئی مطلب نہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو کسی دینی تحریک، ادارے یا سلسلے سے وابستہ ہوگئی ہے۔ اب اس سے صبر نہیں ہوتا کہ کسی طرح صبح ہونے سے پہلے صبح ہوجائے۔ اس کا بس چلے تو صبح انقلاب کے اُجالے کو شب دیجور کی ظلمت چھٹنے سے پہلے ہی برپا کردے۔ انقلاب جیسے صبر آزما عمل اور نظریاتی بھٹی میں پختہ ہوکر کندن بنے بغیر جلد بازی کی شکار طبیعتوں میں پورے ۱۸۰ درجے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایسے ساتھی اکثر یہ پوچھتے پائے جاتے ہیں ''صبح کب ہوگی''؟ وہ وقت کب آئے گا؟ انقلاب کا اصل طریقہ کیا ہے؟ ہم جس سلسلے سے جڑے ہیں اسی طرح چلتے رہے تو سالہا سال تک کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں پھر یہ سب کیا ہے؟ ہم کیا کر رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ قربانیوں کا سفر کب تھمے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔

کب ٹھہرے گا دردائے دل کب رات بسر ہوگی؟
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی!

نوجوانوں کے ساتھ ہونے والی نشست میں یہ آج کے دور میں ملین ڈالر کا سوال ہے کہ انقلاب کیسے آئے گا؟ اکثر حضرات اس حوالے سے افراط وتفریط کا شکار نظر آتے ہیں۔ کچھ تو کسی ایک ہی طریقے کو اوّل بھی قرار دیتے ہیں اور حرفِ آخر بھی۔ ان کے نزدیک اس کے علاوہ سب کارِ فضول ہے اور کچھ تھک ہار کر تمام طریقوں سے مایوس ہو کر حضرت مہدی کی آس میں وہ گھڑیاں بھی بتا دیتے ہیں جن میں وہ ایسا بہت کچھ کر سکتے تھے جو ان کے لیے بھی صدقہ جاریہ بنتا اور لشکر مہدی کے بھی کام آتا۔ اس طرح ان کا حصہ بھی مستقبل میں یقینی طور پر وجود میں آنے والی

---

[1] boltenaqshe@gmail.com

خیر کامل کے برپا ہونے میں ڈل جاتا۔

انقلاب کیسے آئے گا؟ اس سوال کا جواب مختصر بھی ہے اور مفصل بھی۔ ان دونوں کو پلّے باندھ لیا جائے تو اللہ کے حکم سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس جس نوع کی محنت سے انقلاب لا کر دکھایا ان سب کو زندہ کرنے سے ہی اللہ کا امر پورا ہوگا اور ظلمتِ شب ختم ہو کر سحرِ بہار آفریں طلوع ہوگی۔ اسوۂ حسنہ کا ایک جز لینے اور دوسرا چھوڑنے سے اندھیرا ہرگز نہیں چھٹے گا اور نہ فصلِ تمنا ہری ہوگی۔

مفصل جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جامع و مانع صفات عطا کی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامع اور کامل سیرت کے تجزیاتی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکی زندگی کی ابتداء سے لے کر مدنی زندگی کی انتہا تک چند ایسے ہمہ جہت و ہمہ گیر اعمال کیے جن سے اس وقت کی نہایت سنگلاخ زمین نرم اور نم ہوگئی۔ پھر آپ نے کچھ ایسے اعمال کیے جن سے اس زمین میں اعلیٰ قسم کی بیج کاری ہوئی، ایسی فصل تیار ہو کر لہلہانے لگی جس نے آدھی دنیا کی آنکھیں ٹھنڈی اور آدھی کی خیرہ کر دیں۔ یہ وہی اعمال ہیں جن کو امت مسلمہ کی سعید روحیں، جنہیں عرف عام میں ''اکابرین'' کہتے ہیں، زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ اپنے حصے میں آنے والے چراغ کو جلائے ہوئے ہیں اور دوسرے کے حصے میں آنے والے چراغ کی طرف آنے والی سرکش ہواؤں کے سامنے بھی ڈھال بنے ہوئے ہیں۔

کتاب وسنت اور سیرت وتاریخ کا جائزہ لیا جائے تو وہی چھ بڑے بڑے مبارک کام ہیں جو پورے دین کو من حیث المجموع زندہ بھی کرتے ہیں اور نافذ بھی۔ دین کی بقاو حفاظت کے بھی ضامن اور اشاعت واحیاء کے بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سب کر کے دکھائے اور امت کا ہر فرد ان میں سے ہر ایک کو نہ بھی کرے لیکن امت میں مِن حیث المجموع یہ کام ہو رہے ہوں تو امت ان شاء اللہ انقلاب آفریں محنت کی وارثت کو زندہ کرنے والی شمار ہوگی اور جس طرح رات کے بعد صبح کا آنا یقینی ہے اسی طرح اس محنت کے بعد نصرت وفتوحات کا آنا یقینی ہے۔ شرط یہ ہے کہ افراط وتفریط نہ کیا جائے۔ یعنی کسی ایک میں اتنا غلو نہ کیا جائے کہ شرعی حدود سے آگے بڑھ جائیں یا دوسروں کی محنت کی نفی ہوجائے۔ جس انقلاب آفریں سنت میں مزاج زیادہ لگتا ہے اس میں

لگا رہے اور جس کی صلاحیت کم ہے طبیعت ادھر نہیں جاتی یا مواقع دستیاب نہیں اس میں دور سے لگنے والوں کے لیے غائبانہ دعائے خیر اور دامے ورمے سخنے تعاون کرتا رہے۔ اپنے کام کی توصیف یا دوسروں کی تحقیر سے یہ کام ہوتے بھی رہیں تو نتیجہ اتنی دیر سے نکلے گا جتنی دیر کچے پھل کو پکنے میں لگتی ہے۔

ان چھ کاموں میں سے کچھ تو ''مقاصد بعثت'' والی آیت میں صراحتہً مذکور ہیں اور کچھ کتاب وسنت اور سیرت یعنی سیرت کے انقلابی عناصر کے عمومی مطالعے سے سامنے آتے ہیں۔ آیتِ مقاصدِ بعثت جو قرآن شریف میں چار جگہ ہے ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے پانچ ارکان (کلمہ، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج) کو زندہ کرنے کے لیے تعلیم وتدریس بھی کی اور صحابہ کے ظاہر کو درست کرنے کے بعد باطن کی تربیت وتعمیر کے لیے تزکیہ کی محنت بھی سرانجام دی۔ قرآن شریف اور حدیث ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا مبارک عمل بھی آپ انجام دیتے تھے اور جہاد وقتال کا بابرکت فریضہ بھی پوری تن دہی اور اہتمام سے ادا فرماتے تھے۔

الحمدللہ! یہ چار چیزیں امت میں جاری وساری ہیں۔ مدارس وجامعات میں تعلیم وتدریس کی محنت ہو رہی ہے اور خانقاہوں میں سلوک واحسان کی۔ دعوت وتبلیغ کے کام سے لاکھوں مسلمانوں کی زندگیاں شریعت وسنت کے نور سے منور ہو رہی ہیں اور جہاد وقتال کا مقدس فریضہ امت اسلامیہ کے تحفظ اور مستضعفین کی نصرت واعانت جیسا اہم فرض زندہ کیے ہوئے ہے۔ ان چاروں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاست وتدبیر مملکت بھی مثالی تھی اور پسماندہ طبقے کی خدمت وخبر گیری بھی اپنی مثال آپ، لہٰذا خلافت کا سایہ سر پر نہ ہونے کے سبب امت کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرز پر شرعی سیاست بھی کرنی ہوگی اور بے سہارا مخلوق کے لیے فلاحی خدمات بھی زندہ کرنی ہوں گی۔ یہ چھ کام (تعلیم، تزکیہ، دعوت، جہاد، سیاست اور خدمت خلق) مل کر نبوی انقلاب جیسا نتیجہ دوبارہ وجود میں لائیں گے اور انقلاب نامی نتیجہ جب بھی وجود میں آئے گا اس میں ہر اس شخص کا حصہ ہوگا جو انفرادی طور پر اتباع شریعت وسنت کے ساتھ ساتھ ان چھ طرح کی محنتوں میں سے کسی سے بھی جڑا ہوا ہوگا۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۵۲)

اسلام اور پاکستان 'نقیب سحر'

پڑھتا جا شرماتا جا

ا۔ دو تین سال تک انتخابی اصلاحات کے بل پر کام ہوتا رہا۔ کام کرنے والی کمیٹی میں تمام جماعتوں کے منتخب عوامی نمائندے شامل تھے۔ تمام جماعتوں کا متفقہ بل پارلیمانی کمیٹی میں پیش ہوا اور متفقہ طور پر منظور ہوا۔ بل قومی اسمبلی میں گیا اور منظور ہو کر سینیٹ میں پیش کر دیا گیا۔ ایک ترمیم کے ساتھ سینیٹ سے منظور ہو کر پھر قومی اسمبلی میں آیا اور منظور ہو کر صدر مملکت کے پاس گیا۔ وہاں سے دستخطوں کی سعادت حاصل کر کے یہ بل ایکٹ کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ سارا عمل مکمل ہونے کے بعد نشاندہی کی گئی کہ قادیانوں سے متعلق اقرار نامے کی زبان بدلی گئی ہے جو ایک سازش ہے اور ناقابلِ قبول ہے۔ یہ سازش کس نے کی؟ اوپر دی گئی تفصیل کو سامنے رکھیں تو یہ سازش قومی اسمبلی کے تمام اراکین، سینیٹ کے تمام اراکین، حکومت کے کارپردازان اور تمام سیاسی جماعتوں کے چوٹی کے ذمہ داران نے کی، پھر شور بھی مچایا، ترمیم در ترمیم کر کے معاملہ ٹھیک کر دیا اور سب سازشیوں نے داد و تحسین کے ڈونگرے بھی وصول کیے۔ یہ ہے ہمارے سیاسی، دینی، بشمول لبرل سیکولر راہنماؤں کا کردار۔ تف ہے ایسی بدکرداری پر اور تُف ہے ایسی سیاست پر۔ اگر ان کو کچھ شرم ہے تو تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہان کو بشمول دینی سیاسی جماعتوں کے، اپنے اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جانا چاہیے خصوصاً ان مذہبی سیاستدانوں کو جو قومی اسمبلی یا سینیٹ کے رکن بھی ہیں۔

۲۔ صبح و شام کرپشن کے خلاف بیانات آتے ہیں اور یہ بیان بازی کرنے والے (الا ماشاءاللہ) خود بھی اعلیٰ درجے کے کرپٹ ہیں، رہے ہیں اور جب بھی موقع ملے گا کرپشن ہی کریں گے۔ استثنٰی کوئی نہیں۔ سفید پوش ہوں یا پگڑی پوش سب ہی بہتی گنگا سے اپنے ہاتھ، مُنہ اور پیٹ گندا کرتے رہتے ہیں۔ ہاں اگر وطنِ عزیز میں ڈاکٹر امجد ثاقب، عبدالستار ایدھی، عملش چوہدری ذوالفقار چیمہ، سید طاہر شہباز، سردار عالم خان، سید منور حسن، نسیم صادق، احمد جاوید، ڈاکٹر ظفر الطاف، ڈاکٹر شاہد صدیقی، ڈاکٹر ثمر مبارک، ماسٹر غلام قادر وغیرہ جیسے راست باز، خدا ترس اور محنت کش لوگ نہ ہوتے تو (خاکم بدہن) اس ملک کی کشتی کب کی ڈوب چکی ہوتی۔

۳۔ وطنِ عزیز میں ایک سو کے قریب ٹی وی چینل ہیں جو دن ات معاشرے میں ذہنی پراگندگی پھیلا رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر تو ناچ کود، برہنگی، فحاشی اور ثقافتی دہشت گردی، مرد و زن کا

بے حیائی کے ساتھ اختلاط اور جنسی آوارگی پھیلانے والے مناظر سے بھرپور پروگرام اور کمرشلز کا راج ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وقفوں میں برہنہ پروپگنڈہ پر مبنی تجزیے، تبصرے اور بیانات بھی نشر کیے جاتے ہیں جن سے مایوسی، ملک کو غیر مستحکم کرنے اور عوام کے ذہن کو زہر آلود کرنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ آزادیٔ اظہار رائے کے نام پر ہورہا ہوتا ہے۔ کون سی آزادی؟ جو ہوس، زر کے تحت سرمایہ داروں کے پاس گروی رکھ دی گئی ہوتی ہے اور سرمایہ دار بھی وہ جو خود ملک دشمنوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ ان ٹی وی چینلز پر ماشاءاللہ علمائے کرام بھی کبھی کبھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اکثر تو جلووں کی بہار میں لیکن کبھی کبھی جلوہ ہائے رنگ و بو کے بغیر بھی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہ حضرات بھی ذہنی پراگندگی پھیلاتے ہیں جو جوانوں کو اور پڑھے لکھے حساس حضرات کو دینِ مصطفی سے برگشتہ کر رہی ہے۔ ہے کوئی جو اس پر کبھی غور کرے کیونکہ یہ دہشت گردی بھی ہے اور بدترین کرپشن بھی!

۴۔ دفاتر اور دفتری اہل کار ہیں کہ بجائے سہولت پیدا کرنے کے رکاوٹ کے سرچشمے بنے ہوئے ہیں۔ ایماندار اہل کار کسی کا کام کرنے پر راضی نہیں اور بے ایمان اہل کار قاءِ اعظم کی رونمائی کے بغیر بات سُننے کے بھی روادار نہیں۔ عدالتیں ناانصافی اور ظلم کا گڑھ ہیں۔ وکیل حضرات کی اکثریت تو غربت اور ناداری کے باعث انتقام پر اُترے ہوئے ہیں۔ جج، جرنیل اور جرنلسٹ جو چاہیں کرتے پھریں کیا مجال کہ کوئی اُنگلی اُٹھا سکے۔ نظامِ حکومت بدانتظامی کا شکار، نظامِ تعلیم بد حالی کا شکار اور نظامِ دینِ مصطفی علمائے سو کا بازیچۂ شیاطین۔ کیا کریں کوئی تو کل سیدھی ہو لیکن بھلا ہو اُن نفوسِ قدسیہ کا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ اللہ کا عذاب ٹلتا جارہا ہے اور دعا ہے کہ ٹلتا ہی رہے۔

۵۔ خاکی پوش ہوں یا سُرخ پوش، سبز پوش ہوں یا بوسکی پوش اور کھدر پوش ہوں یا ٹوپی پوش، سب کو قومی اداروں کا احترام کرنا چاہیے۔ اداروں کو اپنی آئینی حدود میں رہ کر کام کرنا چاہیے۔ ریاستی اداروں کو ایک دوسرے کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ریاستی اداروں میں قومی استحکام کی خاطر ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ یہ اور اسی طرح کے اور فقرے اکثر سُنتے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے قومی اور ریاستی ادارے ہیں جن کے احترام، آئینی حدود میں کام کرنے اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کا کہا جارہا ہے۔ ہماری نظر میں ان ریاستی اداروں میں نظریۂ پاکستان یعنی نظریۂ اسلام، اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین مقننہ یعنی پارلیمنٹ، انتخابات کے نتیجے میں بننے والی سول حکومت، سول بیوروکریسی، عدالتیں، دفاعی ادارہ یعنی افواجِ پاکستان اور ضروری سمجھا جائے تو میڈیا۔

اب پہلے دوا ادارے یعنی نظریۂ اسلام اور آئینِ پاکستان غیر متنازع فیہ ادارے ہیں بشرطیکہ یہ دونوں ادارے علمائے کرام اور وکلائے عظام کی دست برد سے محفوظ رہیں۔ رہ گئے دوسرے ادارے تو جیسے کہا جاتا ہے کہ" اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے" اس محاورے کے پیشِ نظر شاید ہی ہمارا کوئی ریاستی ادارہ ہو جو اپنے ہاتھوں سے ہی اپنی عزت برباد نہیں کر رہا۔عوام بے چارے تو اس کے متعلق اونچی آواز میں کچھ کہنے سے بھی ڈرتے ہیں کہ مبادا توہین کا الزام لگ جائے یا کسی ریاستی ادارے کی" بے حرمتی" سے ملک عدمِ استحکام کا شکار نہ ہو جائے اور دشمن کو خوش ہونے کا موقع نہ مل جائے۔

۶۔ ہمارا اعظیم جرنیل، جو ڈرتا ورتا کسی سے نہیں عدالتوں میں پیشی کے ڈر سے کمر درد کے بہانے سی ایم ایچ میں پناہ لیتا ہے اور کبھی ملک سے باہر بھاگ جاتا ہے اور باہر جا کر کمر درد کے باوجود ڈسکو ڈانس پارٹیوں میں ناچتا نظر آتا ہے۔ ہمارا نا اہل ہونے والا وزیر اعظم ،وزیر اعظم ہاؤس سے نکلنے کے بعد پوچھتا پھرتا ہے کہ" مجھے کیوں نکالا گیا" اور ہمارا اجری کپتان عدالتوں سے اشتہاری مجرم قرار پا کر اور عدالتوں کو بُرا بھلا کہہ کر احتجاج کرتا پھرتا ہے کہ یہ سب کچھ انتقامی کاروائی ہے کیونکہ اس نے نواز شریف کی کرپشن کے خلاف تحریک اُٹھائی۔اور ہمارا مدبر اسلامی سیاستدان اپنے جثے سے کہیں زیادہ حکومتی کیک کا حصہ لے کر بھی اپوزیشن کرنے کے مزے بھی لے لیتا ہے اور کشمیر کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے وفاقی وزیر کے مفادات اکٹھے کرنے کے باوجود مسئلہ کشمیر کا نام تک لینے میں شرم محسوس کرتا ہے اور ہمارا اعظیم عوامی قائد زرداری کرپشن میں سب پر بھاری،سر سے پاؤں تک کرپشن میں لتھڑے ہونے کے باوجود نواز شریف کو طعنہ دیتا ہے کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اور سب سے بڑھ کر سنگل ممبر پارٹی چیئرمین جناب شیخ رشید صاحب،فرزند راولپنڈی، پنڈی والوں کا ترجمان بنا پھرتا ہے۔

۷۔ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری اسّی کی دہائی میں اتفاق مسجد کے منبر پر بیٹھ کر فرماتے ہیں کہ میں شریف خاندان کا احسان قیامت تک نہیں بھلاسکتا کہ شہباز شریف میری بیماری کے دوران امریکہ میں میرے جوتے بدلواتا تھا اور عمرے کے دوران نواز شریف میری نقاہت کے پیشِ نظر مجھے کندھوں پر اُٹھا کر غارِ حرا تک لے گیا اور اب قیامت کیا برپا ہوئی کہ شریف برادران کے خلاف تبرّہ بازی میں وہ کون سی بد الفاظی ہے جو شیخ الاسلام موصوف استعمال نہیں فرماتے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناب شیخ الاسلام اس وقت سچ فرما رہے تھے یا اب قیامت برپا ہونے کے بعد حق سچ کی بار کر رہے ہیں؟